زندگی کا حکیمانہ تصوّر

ANSARI

زندگی کا حکیمانہ تصور

مصنفہ

سرکار سید العلماء مولانا الحاج سید علی نقی النقوی مدظلہ

ناشر
مکتبہ امامیہ اردو بازار لاہور ۲

ہماری دیگر مطبوعات

- صحیفۂ کاملہ
- متعہ اور اسلام
- کربلا کی شیر دل خاتون
- خلافت و امامت
- اسوۂ حسینی
- قبہ و قبور

ایڈیشن ... ... دوسرا

تاریخ اشاعت ... جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

تعداد اشاعت ... ایک ہزار

مطبع ... ... نقوش پریس لاہور

ناشر ... ... مکتبہ امامیہ لاہور۔۲

قیمت ... ... دو روپے

ترتیب

★

پیش لفظ

عصرِ جدید اسلام و اسلامیات پر بحث و نظر کا ارتقائی عہد سمجھا جا رہا ہے۔ تمدن و علوم کے پھیلے ہوئے افکار و اصول، پروپیگنڈے کے زہر آگیں نعرے اور لیکچر جہانِ اسلام کے نام کے لیے پر پرواز سمجھے جا رہے ہیں۔ علوم جدیدہ کے طالب علم و استاد عقیدہ و روحانی پیاس سے متاثر ہو کر دانشکدوں سے نکل کر ان مقالات و خطبات و افکار کو دیکھتے پڑھتے سنتے ہیں وہ سمجھتے ہیں ہمیں راستہ مل گیا ہم منزل پر پہنچ گئے لیکن صاحبِ نظر جانتے ہیں کہ یہ راستے منزلِ کعبہ نہیں ترکستان تک جاتے ہیں۔ ع ہر کسے را بہر کارے ساختند

دین پر گفتگو، مضبوط اور استدلالی بحث، استخراجِ نتائج کا حق یا ان لوگوں کو ہے جو علماءِ دین ہیں یا وہ لوگ جنھوں نے اصول سے فروع ابتدا سے انتہا تک دینی علوم و مسائل کا مخلصانہ مطالعہ کیا ہو۔ ہمارا طریقہ ہے۔ ع

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

ٹھیک ہے "اہلِ نظر" کو اپنے "شیوے" بدلنا چاہیے۔ ترقی کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان و اسلوبِ فکر، طریقِ افہام و تفہیم میں تبدیلی نہ کرنے سے "آبرو" پر زد آتی ہے مگر ابدی حقیقتیں زمان و مکان کے قیود و حدود، عوام کے طلب و تقاضے سے نہیں بدلا کرتیں۔ نظر وہ نظر اور ذہن وہ ذہن ہے جو پردوں کو چاک کر کے منزل دیکھ لے، رہنما وہ ہے جو طوفانوں، آندھیوں، خطروں اور زلزلوں سے گھبرائے بغیر قافلے کو منزل پر پہنچا دے۔

منطق، فلسفہ، نفسیات جیسے علوم کی خوبیوں کا انکار کون کر سکتا ہے مگر تجزیہ و بحث

کے حق کو عام کر دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ فلالوجی کے ماہر کا سائنس کے مسائل پر لیکچر دینا اور سائنس کے ماہر کا مذہبیات پر بولنا بڑا اعزاز تو ہو سکتا ہے مگر مذہبی امامت کا استحقاق نہیں دلا سکتا۔

یہ ہوٹل میں پلنے، کالج میں پڑھنے اور دفتر میں بیٹھ کر قرآن کے مشکلات یا عالمی مسائل مع اسلام کو منطبق کرنے کی کوشش بے ہودہ ہی نہیں گمراہ کن بھی ہے اور پھر ماخذ دین سے نابلد مصادر بحث سے بے خبر نظریات ہی نظریات پر بحث کا دار و مدار کس قدر مضحکہ خیز بات ہے۔

ہونا یہ چاہیے کہ ذمے دار قلم اور باخبر علماء کو ان مسائل کی طرف متوجہ کیا جائے یا خود دینی مصادر اور بنیادی کتابوں کا خلوص نیت سے مطالعہ کیا جائے۔ اہل خبر سے مشکلات پر بحث کی جائے۔ علماء دین کے نتائج بحث کو دیکھا جائے۔ پھر گفتگو کی جائے اس کے بعد اگر بات جچت اور معقول ہو تو عوام کے سامنے پیش کیجیے لیکن یہ یاد رہے کہ ؎

نہ ہر جائے مرکب توان تاختن

کہ جاہا سپر باید انداختن

حیات بعد الموت اور موت بعد الحیات جیسے مسائل پر غور کرنے والے اسلام دوست احباب اور طالب علم مفروضات کے ذریعے حقیقتوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ حقیقتوں سے حقیقتوں تک کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔

"زندگی کا حکیمانہ تصور" اسلامی اصول و تعلیمات کی روشنی میں مرتب کیے ہوئے نظریات و تشریحات کا مجموعہ ہے جو اس سے پہلے ۱۳۵۴ھ میں "اسلام کی حکیمانہ زندگی" کے نام سے لکھنؤ میں شائع ہو چکا تھا۔ اب مولانا نے نظر ثانی اور کافی ترمیم و تنسیخ کے بعد مشن کو اشاعت کیلئے مرحمت فرمایا ہے۔ اسلامیات کے طلباء اور دین کی حقیقتوں سے باخبر ہونے والے حضرات کیلئے یہ خوبصورت علمی اور ٹھوس مواد اپنی بہترین خوبیوں کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں نذر ہے۔

(مولانا) مرتضیٰ حسین ؒ (صدر الافاضل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سید المرسلین
محمدؐ المصطفیٰ وآلہ الطاہرین ۔

زندگی کیا ہے؟

زندگی کا مفہوم ظاہری حیثیت سے تو بالکل کھلا ہوا ہے لیکن حقیقتاً بہت مبہم ہے۔ "زندگی" صرف کسی شے کے کسی نہ کسی حیثیت سے موجود ہونے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس کے آگے کچھ اور ہے۔

ایک وہ ہے جس کے لیے آپ کہتے ہیں جاندار ہونا۔ یہ زندگی حیوان کی ہے اور اس کا معیار ہے روح کا جسم سے یہ مادی تعلق قائم ہونا۔ یہ زندگی وہ ہے جس کے لیے کسی طرز خاص کے عمل کی ضرورت نہیں ہے وہ تو ایک کیفیت ہے۔ جب تک وہ ہے زندگی ہے اور جب وہ نہ رہی موت ہو گئی۔

اس کے علاوہ ایک زندگی وہ ہے جو ہر ہر چیز کے لیے اس کے اعتبار سے جداگانہ ہوتی ہے اور وہ دنیا کی تمام جاندار اور غیر جاندار چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً جمادات میں دیکھیے زمین بے حس و حرکت چیز ہے اس میں نہ نشو و نما کی صلاحیت ہے نہ شعور و ارادہ کی طاقت، مگر اس میں بھی ایک حالتِ موت ہے اور ایک حالتِ زندگی

وہ اُوسر اور بنجر زمین جو مدت سے خشک پڑی ہوئی ہو۔ جس میں نباتات روئیدہ نہ ہوتے ہوں مردہ زمین ہے اور جب اس میں روئیدگی کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو وہ زندہ زمین ہے قرآن میں متعدد جگہ اس زندگی و موت کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحی بہ الارض بعد موتھا۔ "وہ جو خدا آسمان سے پانی برساتا ہے اور اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔" ایسا ہی بہت سی آیتوں میں ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ آبِ باراں کے چھینٹوں سے اور اس قدرتی آب پاشی کے ذریعہ سے یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دانہ کو روئیدہ کر سکے۔

معلوم ہوا کہ زمین غیر جاندار ہونے کے باوجود ایک وقت میں مردہ کہی جاتی ہے اور دوسرے وقت میں اسے زندہ کہتے ہیں۔

نباتات میں درخت ہے۔ جب تک اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں تر و تازہ ہے اور اس میں برگ و بار لانے کی صلاحیت ہے۔ چاہے موسم خزاں کے تغیرات کی وجہ سے وہ اس وقت پر بار نہ بھی ہو لیکن توقع ہو کہ جب خزاں کا دور گزر جائے گا۔ بہار کا زمانہ آئے گا تو پھر وہ درخت سرسبز و شاداب ہو جائے گا۔ تو اس کو کہا جائے گا کہ یہ زندہ ہے۔ لیکن جب وہ کہنہ ہو گیا اور اس کی صلاحیت جاتی رہی، پتے جھڑ گئے اور اب اس میں ثمر آنے کی امید نہ رہی تو کہا جائے گا کہ درخت مردہ ہو گیا۔

پھول پہلے غنچوں کی شکل میں تھے اس کے بعد کھلے اور رنگ و بو کے حامل ہوئے یہ ان کی زندگی ہے۔ جب مرجھا گئے رنگ و بو رخصت ہوئی تو یہ ان کی موت ہوئی۔

یہ جمادات اور نباتات کی مثالیں تھیں جو ذی روح نہیں ہیں۔ اس سے سمجھنا ہو گا کہ یہ زندگی اور موت جو ہمہ گیر حیثیت رکھتی ہے کچھ اور ہو اور پھر اسی اعتبار سے حیوان اور انسان کے لیے بھی اس کی حیوانی حیات و موت کے علاوہ ایک زندگی اور موت کا تصور لازم ہو گا اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ زندگی کیسی سی زندگی ہے جو بے جان ہونے

کے باوجود ہوتی ہے۔ اور یہ موت کون سی موت ہے جو پہلے سے بے جان ہونے کی حالت
میں بھی ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہماری سمجھ میں آسکے گا کہ جب بے جان چیز زندہ اور مردہ
بن سکتی ہے باوجودیکہ اپنی بے جان حالت پہ قائم ہے تو جاندار چیز بھی زندگی اور موت سے
متصف ہو سکتی ہے۔ باوجودیکہ اپنی جاندار حالت پر باقی رہے۔

اگر ہم نے اس زندگی اور موت کے معنی سمجھ لیے تو پھر ہمارے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جائے
گا کہ انسان کی زندگی کیا ہے اور اس کا صحیح ضابطہ کیا ہو سکتا ہے؟

اس زندگی اور موت کی تشریح کے لیے اسے ذہن نشین کرنا لازم ہے کہ قدرت نے
ہر نوع میں اس کے حدود طبعی کے اندر کچھ صلاحیتیں مقرر کی ہیں اور ہر ایک کا کوئی نقطۂ کمال
ہے کہ وہ نوع ان صلاحیتوں کے درجوں کو طے کر کے اس نقطۂ کمال تک پہنچتا ہے۔

جب تک کوئی شے ان کمالات کی حامل ہے جو اس کے لیے فطرت نے قرار دیے
ہیں یا وہ اس کمال کی راہ میں ہے۔ بایں معنی کہ وہ صلاحیتیں کارفرما ہیں جو اس کمال تک
پہنچایا کرتی ہیں اس وقت تک وہ شے زندہ ہے اور جب وہ صلاحیتوں کو کھو چکی اور اس
کمال سے محروم ہو گئی تو وہ مردہ ہے۔

زمین کی صفت قدرت نے کیا قرار دی ہے؟ یہ کہ وہ نباتات کی پرورش کا گہوارہ بنے
یہ اس کی صفتِ کمال ہے۔ جب تک یہ صفت اس سے دور تھی اور اس میں یہ صلاحیت
کارفرما نہ تھی وہ مردہ کہلائی۔ اور جب اس میں وہ قابلیت پیدا ہو گئی کہ اب اگر دانہ بویا جائے
تو اس کی صحیح طور سے پرورش کر سکے تو وہ زمین زندہ قرار پائی۔ اسی طرح درخت کی صفتِ
کمال یہ ہے کہ اس میں نشوونما ہو وہ بڑھے اور پُربار ہو جبتک یہ صفت پائی جاتی ہے وہ زندہ ہے اور جب یہ صفت
رخصت ہو گئی تو موت آگئی۔ پھول میں قدرت نے رنگ و بو عطا کیا ہے جبتک یہ رنگ و بو باقی ہے وہ زندہ ہے اور جب یہ صفت الگ ہو
گئی وہ مردہ ہو گیا بس یہی تمام چیزوں کی زندگی اور موت کا معیار ہے۔ لہٰذا اسی اعتبار سے انسان کی بھی زندگی

اور موت کی تشخیص کی جا سکتی ہے۔ مگر انسان پر زندگی اور موت کا حکم لگانا کچھ آسان نہیں ہے اسلیے کہ اکثر افراد انسانی ابھی تک انسان ہی کو نہیں سمجھ سکے ہیں کہ وہ کیا ہے اور جب تک انسان کی صحیح معرفت حاصل ہو اس کے نقطۂ کمال اور ان صلاحیتوں کا امتیاز کیونکر کیا جائے جن کے کارفرما ہونے اور نہ ہونے پر اس کی حیات و موت کا انحصار ہے۔ کیونکہ یہ تو پہلے ہی طے ہو چکا کہ زندگی کسی نہ کسی صورت میں موجود رہنے کا نام نہیں بلکہ زندگی کے معنی یہ ہیں کہ جو خصوصیات کمال اس نوع کے ہیں وہ اس فرد میں موجود ہوں یا وہ ان کے حصول کی راہ میں ہو۔ لہٰذا زندہ انسان وہی ہے جو انسانی کمال کا حامل ہو۔ یا وہ صلاحیتیں اس میں کارفرما ہوں جو اس کمال کی منزل کی طرف پہنچا سکتی ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو ممکن ہے وہ بحیثیت حیوان زندہ ہو مگر بحیثیت انسان تو وہ زندہ نہیں ہے۔

اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہم انسان کو سمجھیں کہ وہ ہے کیا۔ اس کے بعد ہم اس کی زندگی کو سمجھ سکیں گے۔ کیونکہ اطبا نے زندگی کو جانچنے کے جو طریقے ایجاد کیے ہیں۔ یا عوام جن صورتوں سے زندگی اور موت کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے آئینہ کو سامنے رکھ کر دیکھا جاتا ہے کہ سانس کا نشان ملتا ہے یا نہیں۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا جاتا ہے یا نبض کی حرکت سے پتہ چلایا جاتا ہے، یہ سب حیوانی زندگی کی تشخیص کے طریقے ہیں لیکن انسان کی بحیثیت انسان زندگی، اس کے لیے یہ تمام ظاہری ذرائع بے کار ہیں۔ اس کے لیے کوئی اور نبض ہونا چاہیئے۔ اس کے لیے کوئی اور آئینہ ہونا چاہیئے۔

اس زندگی کی تشخیص اسی وقت ہو سکتی ہے کہ جب انسان کی معرفت ہو، اور انسانی خصوصیات کمال کا تعین ہو جائے، اس وقت اس کی زندگی اور موت کا صحیح طور پہ سمجھنا آسان ہوگا۔

زیر نظر کتاب اسی مقصد کو سامنے رکھ کر شروع کی گئی ہے۔

انسان کی حقیقت

انسان اگر تمام انواع کائنات سے الگ تھلگ ایک مخلوق ہوتا تو اس کا سمجھنا شاید پھر بھی آسان ہوتا مگر انسان تو مجموعہ عالم کائنات ہے۔ دنیا میں جتنے مرتب اجناس خدا نے خلق کیے ہیں ان تمام اجناس کا مجموعہ ذات انسان کو قرار دیا ہے۔ انسان کے علاوہ تمام انواع کو دیکھیے۔ ہر ایک میں جو صفت کمال نظر آئے وہ انسان میں موجود ملے گی۔ اور اس پر اضافہ ہوگا۔ اس طرح انسان میں جمادات، نباتات اور حیوانات سب کے کمالات ہیں اور پھر ان پر انسانی کمالات کا اضافہ ہے۔ جس طرح کسی چیز کی روح نکالی جاتی ہے تو اس کا لب لباب لے لیا جاتا ہے اسی طرح جمادات میں ایک پہلو کمال کا تھا۔ دوسرا پہلو نقص کا۔ نقص جمادات کا ان کے ساتھ چھوٹا، صنعت کمال کھینچ کر نباتات میں آئی۔ اس کمال میں قدرت نے اضافہ کر کے نباتات کے نوع کی تشکیل کی۔ پھر نوع نباتات میں ایک پہلو کمال کا تھا۔ اور ایک نقص کا۔ کمال کا پہلو قدرت نے جدا کر لیا۔ اور معائب کو چھوڑ دیا۔ اس طرح نباتات کے معائب نباتات کے دامن میں ہے۔ اور کمالات کھینچ کر حیوانات میں آ گئے۔ اس کے بعد قدرت نے نقص حیوانی کو حیوان میں رکھا۔ مگر اس کی صفت کمال کو لے لیا اور ان صفات کمال میں ترقی عطا کر کے اور کچھ اور جوہروں کا اضافہ کر کے نوع انسان کی تشکیل کی۔ اس طرح درحقیقت انسان مجموعہ کمالات نوع امکان ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ — یہ کہ انسان میں جس قدر زیادہ اجناس کی شرکت ہوئی اتنا ہی اس کی حقیقت میں ابہام پیدا ہوتا گیا اور یہ کلیہ ہے کہ جتنے اجزا زیادہ ہوں گے اتنی ہی سمجھنے میں دشواری ہو جائے گی۔

جمادات کے کمال کا دائرہ محدود اور دامن مختصر تھا۔ ان کا سمجھ لینا آسان تھا۔ قدم آگے بڑھا، نباتات کا درجہ آیا تو ان کی حقیقت کچھ مخفی ہو گئی۔ یہاں تک کہ آج یہ مسئلہ علمی دنیا

کا ایک مہتم بالشان محل اختلاف نقطہ بن گیا کہ نباتات میں بھی حس وشعور ہے یا نہیں۔

اس کے بعد حیوان کی نوبت آئی اور جب یہ نقطۂ ارتقار حیوان سے بلند ہو کر انسان تک پہنچا تو اب جتنے اجزا تھے عالم امکان کے مخلوقات میں وہ تمام اجزا منتقر کر انسان میں مجتمع ہوئے۔ اب یہ انسان مجموعہ اجزائے کمالات ہوگیا۔ اس لیے اس کی حقیقت مخفی سے مخفی تر ہوگئی۔

اب رائے قائم کرنے میں دھوکا ہوتا ہے' انسان؟ وہی "جسم" بھی ہے وہی "نامی" بھی ہے وہی "حیوان" بھی ہے۔ "حیوان" کے معنی جانور نہیں بلکہ جاندار، اور انسان تو وہ ہے ہی اب کوئی انسان کو بحیثیت جسم دیکھنے لگتا ہے، کوئی بحیثیت نامی اور کوئی بحیثیت حیوان یہ بہت کم ہے کہ انسان کو بحیثیت انسان دیکھا جائے۔

اور اسی لیے جو ذرائع دریافت حیات کے مقرر کیے گئے ہیں وہ سب بھی انسان کی حیوانی زندگی کی تشخیص کے ہیں۔ انسانی زندگی کی تشخیص اطبار یونان و فرنگ کی قدرت سے باہر ہے۔ انسان اگر انسانی حدود میں مادی چیز ہوتا تو مادی ذرائع سے اسکی حیات اور موت کو دریافت کر لیا جاتا۔ مگر انسان بحیثیت انسان تو مادی چیز نہیں ہے۔ وہ آپ کی نظر کے سامنے نہیں ہے۔ ہم آئینہ میں صورت بھی دیکھتے ہیں تو جسم نظر آتا ہے۔ وہ بھی اس کا رنگ اور شکل۔ یہ تو بہت پست تر کمال ہے انسان کا۔ یعنی "جسمانیت" کے ان عوارض کا حواس ظاہری سے دیکھ کر پتہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن ایک ذرا قدم آگے بڑھا اور حواس ظاہری بے کار ہو گئے۔ یہاں تک کہ جسم نامی کا نمو، حیوان کی حس وحرکت، یہ بھی حدود مشاہدہ سے باہر ہے۔ چہ جائیکہ انسان کی انسانیت۔

اگر انسان نام ہوتا صرف اجزائے مادی کی اجتماعی شکل کا تو وہ اشرف المخلوقات نہ ہوتا اس لیے کہ جتنے صفات اس حیثیت سے پائے جاتے ہیں، ان میں تو انسان کائنات میں اکثر سے پیچھے ہے۔ عظمت جسمانی کو لیجیے تو انسان پہاڑ کے

مقابلہ میں کب آسکتا ہے۔ اگر نشو ونما کو لیجئے تو پودا جتنا جلد حدِ کمال تک پہنچتا ہے اتنے جلد انسان نہیں پہنچتا۔ ماننا پڑے گا کہ صفت نشو ونما میں درخت زیادہ کمال رکھتا ہے احساساتِ ظاہری، باصرہ ولامسہ وشامہ وغیرہ کو لیجیے تو ـــ بہت سے جانور ایسے ملیں گے جن کے یہ احساسات انسان سے زیادہ تیز ہیں۔ انسان میں وہ قوتیں جو حیوانی حیثیت سے پائی جاتی ہیں اکثر حیوانوں سے کم ہیں ۔ اس کے باوجود انسان اشرف ہے تو کوئی جوہر ماننا پڑے گا جو جسمیت، نشو ونما اور حس وحرکت کے علاوہ ہو جو انسان میں ہو دوسروں میں نہ ہو یہی اس کی بلندی کا اصل راز ہے۔ پھر اگر انسان صرف عناصر کے اجتماع کا نام ہو تو انسان کی زندگی کیا ہوتی؟ انہی عناصر کے اجتماع کا قائم رہنا اور انسان کی موت انہی عناصر کا منتشر ہو جانا، جیسا کہ چکبست نے کہا تھا ؎

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

مگر جب انسان حقیقتاً کوئی اور چیز ہے تو اس کی زندگی کچھ اور ہو گی اور موت کچھ اور ہو گی۔

غور کیا جائے تو قدرت نے انسان اور دوسرے حیوانات میں ایک خاص امتیاز قرار دیا ہے۔ دوسرے حیوانات اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ شکمِ مادر سے نکلتے ہی ان کی حس وحرکت کمال پہ ہوتی ہے۔ لیکن انسان کا بچہ جب شکمِ مادر سے متولد ہوتا ہے تو اس کے تمام احساسات بیکار ومعطل ہوتے ہیں، آنکھ ہوتی ہے مگر ٹھہرتی نہیں، ہاتھ ہوتے ہیں مگر قابو میں نہیں، اٹھتے کسی پر ہیں اور پڑتے کسی پر ہیں۔ پاؤں ہوتے ہیں مگر چلنے کی طاقت نہیں۔ حرارت وبرودت کا حس بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ یہ آخر کیا ہے؟ دوسرے حیوانوں کے بچے تمام قوتوں کے مالک مگر انسان کا بچہ تمام قوتوں سے تہیدست۔ یہ ایک ثبوت ہے ڈاروِن کے نظریۂ ارتقا کے خلاف، ترقی کا فلسفہ درست ہوتا تو کل قوتیں انسان میں

پوری قوت کے ساتھ آئیں اور اس کے بعد ان میں اضافہ ہوتا مگر انسان میں ابتدائے قوت کا مفقود ہونا اور رفتہ رفتہ ترقی پانا بتلاتا ہے کہ اسکی ابتدا بھی یہیں سے ہے اور انتہائی ترقی بھی یہیں ہے یہ جو کچھ کمال حاصل کرتا ہے وہ پس ماندہ اموال کی طرح نہیں ہے کہ جو مورث اعلیٰ سے اس کے ہاتھ آتا ہو، بلکہ جتنے کمالات ہیں وہ اس کی ذاتی صلاحیتوں کے نتائج وہ اپنی موجودہ طاقت سے ہی آگے بڑھتا ہے اور حد کمال تک پہنچتا ہے۔ قرآن میں خلقت انسان کا تذکرہ جو خالق انسان نے کیا ہے وہ دیکھنے کا ہے۔

لقد خلقنا الانسان من صلالۃ من طین "ہم نے انسان کو مٹی کے پتلے کی صورت میں پیدا کیا"

یہ سب سے پہلی مرتبہ کی خلقت یعنی خلقت آدم کا ذکر ہے جس کی تشریح اس وقت موضوع کلام سے خارج ہے۔

ثم جعلناہ نطفۃ فی قرار مکین - اس کے بعد ہم نے یہ نظام قرار دیا کہ اس کو ہم نے نطفہ بنایا - اور قرار دیا ایک پر سکون استقرار کی جگہ (بطن مادر) میں - فخلقنا النطفۃ علقۃ اس کے بعد ہم نے اس نطفہ کو علقہ کی شکل میں تبدیل کیا۔ فخلقنا العلقۃ مضغۃ "پھر ہم نے اس علقہ کو ایک گوشت کے ٹکڑے کی شکل میں تبدیل کیا۔ فخلقنا المضغۃ عظاما فکسونا العظام لحما اس گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ تیار کیا اور اس پر ہم نے باریک گوشت کا غلاف چڑھایا - یہ تمام جسم انسانی کی ساخت کے منازل ہیں جنھیں ترتیب کے ساتھ بیان کر دیا۔

اب منزل قریب آگئی تھی - سیاق کلام امید افزا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ قدرت مصروف اظہار ہے - اب حقیقت انسان معلوم ہو جائے گی - لیکن قلم بیان اس غلاف کی تکمیل تک پہنچکر رک گیا۔

اب اس حجابِ قدس میں آکر اترے گا کون؟ یہاں تک پہنچتے ہی اندازِ کلام بدل گیا۔ تفصیل ابہام کی طرف منتقل ہو گئی، پردہ ڈال دیا گیا۔ ثم انشأناہ خلقاً آخر "پھر ہم نے اسے کچھ اور بنا دیا۔"

یہ کچھ اور کیا ہے؟ وہ وہی ہے جس کی ابتدا بھی ہم کو نہیں معلوم اور انتہا بھی ہم نہیں جانتے، وہ وہی ہے جو کچھ اور ہے۔

اس کے پہلے تھا۔ خلقنا النطفۃ علقۃ خلقنا العلقۃ مضغۃ خلقنا المضغۃ عظاما۔ "ہم نے اسے یوں بنا دیا۔ یوں کر دیا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ کچھ تھا اور جو تھا اسی کی کچھ حالت میں تبدیلی ہوئی یعنی ایک ہی شے پر دوسری کیفیت طاری کی گئی۔ نطفہ تھا، اسی نطفہ کا علقہ بن گیا۔ اس کو مضغہ بنایا، اسی مضغہ میں ہڈیاں پیدا کی گئیں۔

لیکن اب الفاظ بھی بدلتے ہیں "خلقنا" نہیں کہا، انشأنا کہا گیا۔ جس سے پتہ چلا کہ یہ چیز وہ ہے جو اپنے ماقبل سے بالکل اجنبی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس جسم میں کچھ انقلاب ہوا ہو اور یہ چیز تیار ہو گئی ہو۔ بالکل نہیں۔ یہ قرار دینا نہیں ہے۔ یہ کسی شے کو کوئی شے بنانا نہیں ہے۔ بلکہ ایجاد کرنا ہے "نیست" کو "ہست" کرنا ہے۔

یہی رازِ سربستہ حقیقتاً انسان ہے۔ اس کا سمجھنا ہمارے لیے ممکن ہوتا تو قرآن مبین کو بیان کے لیے الفاظ کیوں نہ ملتے؟ ماننا پڑتا ہے۔ کہ یہ حقیقت ہمارے فہم سے بالاتر ہے۔ تاہم اس امتیازی کمال کا پتہ تو لگانا ہی چاہیے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے میری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ انسان کا خصوصی کمال ہے خود اختیاری علمی و عملی ترقی، یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے جمادات و نباتات و حیوانات ہی نہیں بلکہ ملائکہ کے مقابلہ میں بھی انسان کو امتیازِ خاص حاصل ہوا ہے۔

جمادات و نباتات اور حیوانات سے تو انسان اس لیے افضل ہے کہ انکی طبیعت میں

بلندی ہے ہی نہیں، پستی ہی پستی ہے۔ لیکن ملائکہ بلاشبہ بلند مخلوق ہیں، کسی کو کیا حق کہ وہ ان کی منزل کو پست کہے۔ معصوم ہستیاں اور بے گناہ مگر ان کی عصمت کی تعریف ویسی ہے جیسی موتی کے آب و تاب کی۔ اس لیے بطور بیان واقعہ ان کی بلندی کا اعتراف ضروری ہے۔ لیکن وہ کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ ان کی ذات میں عصیان کا وجود نہیں ہے لیکن بایں معنی کہ قوت عصیاں خلق ہی نہیں، جذبات جو محرک گناہ ہیں ان میں پیدا ہی نہیں کیے گئے ہیں۔ لہٰذا ان کی عصمت کسی جہادِ نفس کی حامل نہیں ہے۔ مگر انسان متحارب قوتوں کا مالک ہے اور ایک جنگ ہے جو اس مختصر سی دنیائے جسم انسانی میں برپا رہتی ہے ایک طرف نفس امارہ کی طاقتیں ہیں جو اپنی طرف لے جانا چاہتی ہیں۔ دوسری طرف عقل ہے جو حتی المقدور برائیوں سے روکنا چاہتی ہے۔ ان متحارب طاقتوں میں انسان رکھا گیا ہے کہ وہ اپنی نظر سے امتیاز کر کے ایک راستہ اختیار کرے۔ اب اگر انسان نے ان تمام متحارب قوتوں کو دیکھ بھال کر عقل کا ساتھ دیا۔ اور نفس سے بیزاری اختیار کی۔ تو کیا کہنا، بھر تو لڑ بھڑ کر فتح کرنے والا ظفر یاب مجاہد ہے۔ راستہ چلتے کوئی مال و دولت ہاتھ نہیں آ گیا ہے بلکہ اپنے قوت بازو سے جنگ کر کے فتح و ظفر حاصل کر کے، ملک طاعت پر قبضہ کیا ہے یہ انسان ہے جو ملائکہ کے سامنے آتا ہے تو فتح مندی کا نشان سر پہ لہراتا ہوا آتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ دوسرے کا دیا ہوا ہے اور اس کو جو کچھ ملا ہے اپنی قوت اختیار سے۔ اس کے علاوہ ان کو جو کچھ ملا ہے بس اتنا ہی ان کے پاس ہے۔ مگر انسان حاصل کرتا ہے تو پھر اپنی قوت عمل سے اس کو بڑھاتا جاتا ہے معلوم ہوا کہ انسان کی خود اختیاری ترقی یہی وہ چیز ہے جس نے ملائکہ کے مقابلہ میں اس کو شرف دے دیا۔ ملائکہ علم بھی رکھتے ہیں اور عملی حیثیت سے بھی معصوم ہیں۔ لیکن علم بھی اتنا ہی ہے جتنا دے دیا گیا ہے اور طاعت بھی اسی حد تک جس پر مخلوق ہو گئے۔ اس کے خلاف کرنے کے لیے دل ہی نہیں۔ دل کے ساتھ

خواہشیں نہیں، خواہشوں کے ساتھ جذبات نہیں، کہدیا، کھڑے رہو، کھڑے ہوئے ہیں
کہہ دیا جھک جاؤ، رکوع میں رُکے ہوئے ہیں۔ کہہ دیا سجدے میں چلے جاؤ، سجدے
میں ہیں۔

انسان علمی حیثیت سے بھی خود اختیاری ترقی کرنے والا ہے اور عملی حیثیت سے
بھی خود اختیاری ترقی کرنے والا، یہی وہ چیز تھی کہ جب امتحان کا موقع آگیا اور
ملائکہ سے مقابلہ ہوگیا تو انسان نے اسی جوہر سے کامیابی حاصل کر لی۔ مقابلہ ہوگیا تھا اس
وقت جب "پیشین گوئی ہوئی تھی۔ انی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ۔ "میں زمین میں
اپنا ایک جانشین مقرر کرنے والا ہوں"۔

ملائکہ نے کہا کہ اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء ونحن
نسبح بحمدک ونقدس لک۔ "کیا خلیفہ وہ مقرر کیے جائیں گے جو زمین میں فساد
برپا کریں اور خونریزیاں کریں؟"

ارشاد ہوا۔ انی اعلم مالا تعلمون۔ "میں جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔"

جب خلقتِ آدم ہوگئی تو خالق نے ملائکہ کے سوال کا جواب دینا چاہا۔ اور اس
کے لیے یہ انتظام کیا کہ وعلم ادم الاسماءَ کلھا۔ "آدم کو تمام نام بتلا دیے۔"
ثم عرضھم علی الملائکۃ۔ "پھر ملائکہ کے سامنے انھیں پیش کیا، اور کہا۔
انبئونی باسماء ھؤلاء ان کنتم صادقین۔ اور ان کے نام بتلاؤ تو اگر
سچ کہتے ہو۔ انھوں نے کہا۔ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت
العلیم الحکیم۔ "پاک ہے تیری ذات ہم کو نہیں ہے علم مگر اتنا، جتنا تو نے
ہم کو تعلیم کر دیا۔ علم و حکمت تو بس تجھ ہی سے مخصوص ہے۔ قال یا ادم انبئھم
باسمائھم۔ خطاب حضرتِ احدیت ہوا آدم سے۔ "اے آدم انھیں بتلاؤ تو
نام"۔ فلما انبأھم باسمائھم جب آدم نے نام بتلا دیے تو قال الم

اقل لکم انی اعلم غیب السموات والارض، واعلم ماتبدون وما کنتم تکتمون۔

ارشاد حضرتِ احدیت ہوا۔ "میں نے نہیں کہا تھا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

یہ نام کیا تھے؟ بعض لوگوں نے سمجھا ہے کہ تمام مفرد الفاظ مگر ملائکہ اور آدم کا مقابلہ اور اس میں فرہنگ لغت کا امتحان! یہ سمجھ میں آنے کی بات نہیں۔

بے شک قرآن میں ہے الاسماء کلہا، "تمام نام سکھائے" اور اس سے سطحی نگاہ والے دھوکا کھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "کل" کا لفظ عموم وشمول چاہتا ہے مگر انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ "کل" اتنے ہی دائرہ میں عموم وشمول چاہتا ہے جو اس کے قبل کے الفاظ سے مراد لیا گیا ہے۔ اگر "الاسماء" میں "ال" عموم وشمول کا ہے یعنی تمام دنیا کے "نام" تو بے شک آیت اس میں عموم وشمول پیدا کرے گی۔ لیکن اگر "اسماء" پر "ال" عہد کا ہے یعنی "اسماء" سے کچھ خاص اسم مراد ہیں تو "کلہا" اتنے ہی دائرہ میں آکر عموم پیدا کر سکتا ہے۔

"کلہا" کے معنی ہیں "سب کا سب" اس کے قبل کے لفظ کو دیکھئے۔ دنیا کو کہا "سب کی سب" اس میں ایرانی، افغانی، جاپانی، یوروپین سب داخل۔ اہلِ ایشیا کو کہا "سب کے سب"۔ "سب کے سب" کا لفظ نہیں بدلا مگر اس میں یورپ والے داخل نہیں۔ اہلِ ہندوستان سب کے سب۔ "سب کے سب" کا لفظ تو وہی رہا مگر اب ایشیا کے اور دوسرے مقامات والے لوگ سب نکل گئے۔ "اہلِ اودھ سب کے سب" اب "سب کے سب" میں پنجاب والے نہیں داخل ہیں۔ "اہلِ لکھنؤ سب کے سب" اس میں اب فیض آباد والے داخل نہیں ہوں گے۔ "حاضرین سب کے سب" اب کوئی بھی جو یہاں حاضر نہیں ہے داخل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح یہاں الاسماء سے اگر جمادات،

نباتات، حیوانات سب کے نام مراد لیے جائیں تو بے شک "کلھا" اس میں عموم لائے گا اور کوئی استثناء نہ رہے گا۔ لیکن اگر "الف لام" عہد کا ہے اور اس سے اشارہ خاص کی طرف منظور ہے یعنی "تلک الاسماء کلھا" "وہ نام سب کے سب" — اب "سب کے سب" عموم و شمول کا ذمہ وار نہیں رہے گا۔ جب تک کہ "وہ" کو نہ دیکھ لیجئے۔ تو اب "وہ" کون ہیں؟ میں ہاتھ سے اشارہ کرتا ہوں۔ وہ حضرات "سب کے سب"۔ اب "وہ حضرات" کو دیکھیے کہ میں نے دس کی طرف اشارہ کیا یا بارہ کی طرف، "سب کے سب" اسی دائرہ میں آکر عموم و شمول پیدا کریگا کہ ان میں سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے بہرحال ان اسماء میں نہیں بتلانے کو کہا تھا کوئی نہیں چھوٹیگا لیکن وہ کون خاص اسماء ہیں یہ دوسری چیز ہے۔ اس کے بعد وہ لفظ ہے جس پر عام طور سے غور نہیں کیا جاتا ثم عرضھم علی الملائکۃ۔ اسماء اسم کی جمع ہے اور جمع حکم تانیث میں ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے لبعد کہا گیا ہے علم آدم الاسماء کلھا۔ یہاں اسماء کی طرف ضمیر پھیری گئی ہے۔ "کلھا" مؤنث کی کلھم نہیں کہا گیا ہے اور نہ صحیح ہے اس کے بعد بظاہر ہونا یہ چاہیئے تھا، ثم عرضھا علی الملائکۃ انہی ناموں کو ملائکہ کے سامنے پیش کیا۔ مگر قرآن نے الفاظ بدل دیے۔ کہا ثم عرضھم علی الملائکۃ اب اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "پھر پیش کیا ان لوگوں کو ملائکہ کے سامنے"۔ کیونکہ ھم کی ضمیر ذوی العقول ہی کے لیے ہوتی ہے۔ جس کے معنی ہوتے ہیں "وہ لوگ"۔ مطلب یہ ہوا کہ آدم کو تمام نام تعلیم کیے۔ پھر پیش کیا ان لوگوں کو۔"

ظاہر ہے کہ نام خود لوگ نہیں ہوا کرتے۔ پھر ان ناموں میں تو عام مفسرین کے قول کے مطابق حیوان بھی ہیں۔ دیواریں بھی ہیں، در بھی ہیں، کیڑے مکوڑے بھی۔ یہ تو خود اشیاء بھی ذوی العقول نہیں ہیں۔ چہ جائیکہ ان کے نام۔ پھر اس کے لبعد قرآن مجید میں ہے "فقال انبئونی باسماء ھؤلاء" اگر نام پیش ہی کر دیے گئے تھے تو پھر دریافت کیا چیز ہو رہی ہے؟ یعنی آپ کسی لڑکے سے پوچھئے کہ "ب" کے بعد "ت" کون سا

حرف ہے؛ وہ کہہ دے گا کہ آپ نے تو خود ہی تبلا دیا کہ "ت"۔ نام پیش کر بھی دیے گئے اور پھر پوچھا بھی جا رہا ہے کہ ہاں نام تو بتاؤ۔ پھر اس صورت میں انبأ وا بھذہ الاسماء ہونا چاہیئے۔ "یہ نام بتلاؤ"۔ مگر وہاں یہ ہے۔ انبئوا باسماء ھؤلاء "ان لوگوں کے نام بتلاؤ"۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ معنی جو دنیا والوں نے قرار دیے ہیں آیاتِ قرآن سے بیگانہ ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ آدمؑ کو نام تعلیم کیے گئے تھے مگر شخصیتیں ان کے سامنے نہیں لائی گئی تھیں۔ اور ملائکہ سے وہی نام نہیں دریافت کیے گئے۔ تاکہ یہ کہا جائے کہ جو آدمؑ کو بتلا دیا گیا تھا وہی اب ملائکہ سے پوچھا جا رہا ہے حالانکہ انھیں نہیں بتایا گیا ہے بلکہ اب وہ ہستیاں پیش کی گئیں جن کے نام تھے۔ یہ امتحان ذہانت کا تھا مسمیات دکھلائے جا رہے تھے۔ کہ ان کو دیکھ کر اسماء کی تطبیق کرو۔ یعنی یہ بتاؤ کہ کون نام کس کا ہے؟

یہ چیز تبلائے ہوئے حدود سے خارج تھی۔ ملائکہ کا علم تھا محدود جتنا قدرت کی طرف سے حاصل ہوا بس اتنا ہی ان کے پاس موجود ہے۔ لیکن معلومات سے مجہولات کا علم حاصل کرنا، بات سے بات پیدا کرنا علمی ترقی خود اختیاری حیثیت سے اس حد تک کرنا یہ انسانیت کا جوہر خاص تھا۔

ملائکہ نے اپنے قصورِ طبیعت کا اعتراف کیا۔ کہا۔ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم۔ بارِ الٰہا ہم تو اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا ہم کو تو نے تعلیم دیا ہے۔ ہمارے بس کی یہ بات نہیں کہ ہم اس سے زیادہ کچھ بتا سکیں۔

اب نظرِ قدرت انسان کی طرف متوجہ ہوئی۔ ہاں انسان! یہ تیرے جوہر کے نمایاں ہونے کا وقت ہے تو نے بھی اگر اتنا ہی بتایا تو ملائکہ میں اور تجھ میں امتیاز ہی کیا ہوا۔ اب تو بتا دے کہ ان ناموں میں سے ان صورتوں کے کون سے نام ہیں۔

اب یہ انسان تھا جو بتائی ہوئی بات سے زیادہ بتا سکتا تھا۔ اس نے اپنی قوتِ تمیز

اور شعورِ خاص سے کام لیا۔ ناموں کو دیکھا، مسمیات پر غور کیا، مناسبتوں پر نظر کی اور بتا دیا کہ یہ اس کا نام ہے۔ یہ اس کا نام ہے۔ اس طرح انسان کا امتیاز ثابت ہوا۔ کہ ہر چیز ترقی کرتی ہے مگر وہ ترقی خود اختیاری ترقی نہیں ہوتی۔ انسان کے علاوہ دوسری چیزوں میں "تکوینی" ترقی ہوتی ہے اور انسان کی ترقی اس کے قوت بازو سے ہوتی ہے۔ اپنے ارادہ و اختیار سے ہوتی ہے۔ ایک تو یہ فرق ہے انسان اور غیر انسان میں اس کے علاوہ دوسرا فرق یہ ہے کہ ان کی ترقیاں محدود ہیں۔ اس لیے کہ عالمِ امکان میں سب سے نیچے جمادات ہیں۔ جن کے آگے نباتات موجود ہیں۔ جماد کی نوع قدم آگے بڑھائیگی تو جماد کا دور ختم ہو جائے گا۔ نباتات کی سرحد آجائے گی، لہٰذا ترقی محدود ہوئی۔ اسی طرح نباتات ترقی کرینگے تو محدود ترقی کریں گے۔ کیونکہ ان کے آگے حیوانات کا پہرا بیٹھا ہوا ہے۔ اور حیوانات ترقی کریں گے تو کہاں تک؟ ان کے آگے انسان پرا جمائے ہوئے ہے

معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر چیز کی ترقی محدود ہے لیکن انسان وہ لامحدود ترقی کرنے والا ہے کیونکہ وہ عالمِ امکان کا نقطۂ آخر ہے کوئی درجہ انسان سے بالاتر نہیں ہے اس لیے انسان کے لیے ترقی کا دروازہ کھلا ہوا ہے اس کی ترقی کہیں پہ جا کر رک نہیں جاتی۔ اس لیے کہ عالمِ امکان کی کوئی حد نہیں ہے۔ اور یہ انسان آخری سرحد ہے عالمِ امکان کی۔ لہٰذا اسکی ترقی لامحدود حیثیت رکھتی ہے۔

چونکہ امکان کا سرا وجوب سے ملا ہوا ہے اور وجوب لامحدود ہے حدودِ امکان کے ختم ہو جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس پر اگر ایک نمبر اور بڑھا دیا جائے تو وہی وجوب کا درجہ ہے۔

معلوم ہوا کہ اگر امکان محدود ہو تو وجوب بھی محدود ہو جائے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ "ممکن" جو ملتا ہے وہ واجب سے۔ اگر ممکن محدود ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ واجب کا فیض محدود ہو گیا اور یہ

ناممکن ہے۔

عام فہم مثال یہ ہے کہ ایک فقیر ہے جس کو جو کچھ ملتا ہے کسی ایک غنی کے اشارہ سے ملتا ہے۔ اب فرض کیجیے کہ اس غنی کا خزانہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ تو کیا میں نہ کہوں کہ اس فقیر کا سہارا کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

اب باوجودیکہ امکان محدود ہے لیکن محدود ہونے کے ساتھ وہ لامحدود ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنا بھی عالم وقوع میں آئے اور ممکن جتنے درجوں کو بھی طے کرلے وہ ہمیشہ محدود ہی ہوں گے۔ لیکن پھر بھی لامحدود ہے۔ یعنی اس سے بھی زیادہ ہوسکتا ہے کسی درجہ پر ٹھہرتا نہیں ہے۔ جیسے "اعداد لامحدود ہیں۔ پھر بھی محدود ہیں" اس معنی سے کہ جتنے عدد ہوں گے وہ محدود ہوں گے۔ اگر محدود نہ ہوتے تو معدود کیونکر ہوتے یعنی شمار میں کیونکر آتے؟

لیکن آپ اپنے نزدیک بڑے سے بڑا عدد لیجیے۔ ایک دن بھر ہزار ہزار لکھے جایئے اور شام کو مہاسنکھ کہہ دیجیے۔ تو میں کہوں گا اس پر ایک اور اضافہ کر دیجیے۔ لہٰذا لامحدود تھا۔ یعنی ہمیشہ قابلِ اضافہ ہے۔ یونہی امکان کے مدارج ترقی ہیں۔ جتنا عالم وجود میں آئے گا وہ محدود ہی ہوگا۔ اگر لامحدود ہو تو "واجب الوجود" قرار پائے گا۔ لہٰذا یہ ہمیشہ محدود ہی ہے لیکن پھر بھی لامحدود ہے۔ یعنی ہمیشہ قابلِ اضافہ ہے۔

اسی لیے وہ ہستی جو عالمِ امکانی کا فرد منتخب تھی اور عالمِ امکانی میں جس سے بڑھ کر کوئی فرد عالمِ وجود میں نہیں آیا۔ یعنی جناب رسالتمآبؐ جو آخری نقطہ تھے مدارجِ کمالِ انسانیت کا جن کے بعد انسانیت نے قدم نہیں بڑھایا۔ جن کے بعد پھر ظرفِ زماں میں وسعت نہ تھی۔ یہ آخری ہستی تھی۔ مگر یہ آخری ہستی بھی آخری وقت تک یہی کہتی رہی کہ "ربّ زدنی علماً" خداوندا میرے علم میں اضافہ کر۔ اس کا راز یہی ہے کہ خدا کا خزانہ ختم نہیں ہوتا کسی کے فیض و کرم میں پھر بھی گنجائش ہے۔ اس لیے

برابر سوال کرتے تھے اور ادھر سے فیوض کی بارش میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اور درجے بلند ہوتے رہتے تھے۔

اب انسان کی زندگی کیا ہوئی؟ علم اور عمل میں بلندی کے درجہ پر فائز یا اس کے حصول کے لیے کوشاں اور اس ترقی کی راہ میں ہونا اور اس کی موت کیا ہوئی؟ ان ترقیوں کی شاہراہوں کا مسدود ہو جانا اور اس کے دل و دماغ کے دروازوں کا اس طرح بند ہو جانا کہ وہ جہالت پر قانع ہو جائے اور اس کے ضمیر کا ایسا خوابیدہ ہو جانا کہ وہ اپنی پست کرداریوں سے مطمئن ہو جائے۔

اب یہ سمجھنا آسان ہے کہ کون سا آئین ایسا ہے جو انسان کے لیے مکمل ضابطۂ حیات بن سکے۔

جس قانون نے اور جس مذہب نے انسان کی علمی و عملی ترقی کے لیے راہیں صاف کی ہوں اور اس کو علمی و عملی ترقیوں کے راستے بتائے ہوں وہی انسان کی زندگی کا صحیح رہنما ہو سکتا ہے۔ اور جو مذہب انسان کی علمی و عملی ترقیوں پر پہرے بٹھائے اس کو ماننا پڑے گا کہ وہ آئین اور قانون ناکارہ ہے۔ اس معیار پر اسلام کو لائیے دوسرے تمام دنیا کے مذاہب کے مقابلے میں۔ اور دیکھیے کہ اسلام نے کہاں تک علمی و عملی ترقیوں کے سبق دیے ہیں اور راستے صاف کیے ہیں اور دوسروں نے کس طرح انسان کو جکڑا اور اس کی ترقیوں کو روکا ہے۔ اس معیار پر ماننا پڑے گا کہ اسلام ہی انسان کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

مذاہبِ عالم اور انسانی ترقّی

ہم جس وقت دنیا کے مذاہب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں دوسرے مذاہب نے علمی و عملی ترقی کے راستے بجائے صاف کرنے کے ان پر پہرے بٹھا دیے ہیں، اس کی تشریح کو دو بابوں میں منقسم سمجھنا چاہیئے۔ ایک علمی حیثیت اور دوسری عملی حیثیت۔

اِنسان کی علمی ترقی اور مختلف مذاہب کی تعلیمات

علمی ترقی کے لیے قدرت نے انسان میں جوہرِ عقل ودیعت کیا تھا۔ لیکن دنیا کے مختلف مذاہب نے عقلوں پر پہرے بٹھائے۔ آنکھوں پر پردے ڈالے، غور کرنے کو گناہ قرار دیا۔ ان کی تعلیم یہ رہی کہ آنکھ بند کرو اور مان لو آنکھ کھولی تو کفر و الحاد کا الزام لگایا۔ مذہب کی تعلیم یہ رکھی کہ اعتقادات ایک چیز ہیں اور عقل دوسری چیز ہے یعنی اعتقاد میں عقل کو دخل نہ دو۔ کسی عیسائی عالم کے پاس جاکر مسئلہ تثلیث کو دریافت کیا جائے کہ ایک ہی چیز بوقت واحد تین بھی ہے اور تین ہوتے ہوتے ایک بھی۔ یہ کیونکر؟ تو وہ کہے گا کہ یہ عقلِ انسان سے بالاتر ایک راز ہے۔ اس کی بنیاد بس ایمان پر ہے عقل سے کام نہ لو۔ اگر فدیہ کے رمز کو پوچھا جائے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک انسان دوسرے کے گناہ کا بار اپنے اوپر لے لے۔ اور ایک کے سولی پر چڑھائے جانے کے بعد ہمیشہ کے لیے دوسرے مطلق العنان ہو جائیں تو وہ کہے گا کہ اس پر ایمان لانا چاہیئے۔ یہ عقل سے تعلق نہیں رکھتا۔

اس کے خلاف اسلام ہمیشہ صاحبانِ عقل کو مخاطب کرتا ہے اور اپنی فتح اسی میں سمجھتا ہے کہ لوگ عقل وغور سے کام لیں۔ مذہب اور اہلِ مذہب کی ذہنیت اس کے روایاتِ مذہبی سے ثابت ہوتی ہے۔

توریت کو دیکھیے جسے یہود ونصاریٰ اپنی مقدس کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ عہدِ قدیم کے نام سے موسوم ہے جس کے لاکھوں کروڑوں نسخے ہر سال دنیا میں شائع ہوتے ہیں جس کا ہزاروں زبانوں میں ترجمہ ہو چکا جس پر سلطنتوں کی طاقت صرف ہو رہی ہے۔

اس میں حضرت آدمؑ کا قصہ حسب ذیل صورت سے درج ہے:-

ملاحظہ ہو توریت سفر پیدائش ب ۲

خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے کے لیے اچھا تھا زمین سے اگایا۔ اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک وبد کی پہچان کا درخت بھی لگایا اور خداوند خدا نے آدم کو لے کر باغِ عدن میں رکھا کہ اسکی باغبانی اور نگہبانی کرے اور خداوند خدا نے آدمؑ کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کے درخت کا پھل کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا مرا۔

ب ۳ - اور سانپ کل دشتی جانوروں سے جن کو خداوندِ خدا نے بنایا تھا، چالاک تھا۔ اور اس نے عورت سے کہا، کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا؟ عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل تو ہم کھاتے ہیں پر جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ اسے کھانا اور نہ چھونا

ورنہ مر جاؤ گے۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے، بلکہ
خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔
اور تم خدا کے نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔ عورت نے جو
دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لیے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا
ہے اور عقل بخشنے کے لیے خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا
اور اپنے شوہر کو بھی دیا۔ اور اس نے کھایا۔ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور
ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انھوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے
لیے لنگیاں بنائیں اور انھوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت
باغ میں پھرتا تھا سنی اور آدمؑ اور اس کی بیوی نے آپ کو خداوند خدا
کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدمؑ کو
پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے باغ میں
تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا
اس نے کہا۔ تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اس درخت کا
پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا؟ آدمؑ نے
کہا کہ جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا
پھل دیا اور میں نے کھایا۔ تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے
یہ کیا کیا؟ عورت نے کہا کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔ اور
خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے
ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے، اور
حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس
لیے خداوند خدا نے اس کو باغ عدن سے باہر کر دیا۔"

یہ ہے توریت کا بیان۔ اس سے سبق کیا حاصل ہوتا ہے۔ یہی کہ نیک وبد کی پہچان بُری چیز ہے۔ عقل کا صرف کرنا معصیت ہے۔ یہی چیز وہ تھی جس نے آدم کو جنت سے نکالا۔

اس کے برخلاف اسلام نے کیا تعلیم پیش کی؟ وہ جس کا اس کے پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ جب انسان کا مَلک سے مقابلہ پڑا تو یہی صفت علم ایسی تھی جس نے ملائک پر فتحیاب کردیا۔ جنت سے نکلنے کے واقعہ کو قرآن نے بھی بیان کیا ہے۔ مگر ہمارے روایات میں یہ ہے کہ وہ درخت گیہوں کا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز منع کی گئی تھی وہ انسان کی روحانیت سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ مادیت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سے جو سبق حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ مادی خواہشوں میں زیادہ منہمک نہ ہو۔ رہ گیا علم، علم وہ چیز ہے کہ ملائکہ پر جس سے شرف حاصل ہوسکا۔

علمی ترقی اور اسلام کی تعلیمات

یہ تعلیم کہ انسان کو علم حاصل کرنا اور عقل سے کام لینا حرام ہے۔ بالکل فطرت کے خلاف ہے۔ حضرت احدیت نے انسان کو جوہر عقل عطا کیا اور اس جوہرِ عقل کے ذریعہ سے انسان کے لیے علمی ترقی کے راستوں کو کھولا۔ اگر انسان کا آنکھیں بند کیے رہنا قدرت کے نزدیک مناسب ہوتا، تو اس کو آنکھیں دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

قدرت نے تو جو چیز دی ہے وہ کام لینے کے لیے دی ہے۔ اگر اس پر پابندی عائد کی جائے ایسی کہ وہ معطل ہوجائے تو وہ شے بیکار اور عبث ہوجاتی ہے۔ آنکھیں عطا کی گئی ہیں دیکھنے کے لیے۔ اگر آنکھوں کے بند رکھنے کا حکم

دیا جاتا کہ وہ آنکھیں کور ہو جائیں تو پھر آنکھیں دینے کا کیا نتیجہ تھا؟ قوتِ سامعہ عطا کی۔ لیکن اگر حکم ہوتا کہ اس کو بند کیے رہو تو کچھ دن میں وہ قوت فنا ہو جاتی۔ اس لیے کہ جس قوت سے کام نہ لیا جائے وہ قوت انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ وہ لوگ کہ جو کسی وجہ سے کچھ دن تک صاحبِ فراش رہے ہوں کسی وقت جگہ سے اٹھتے نہ ہوں اور پابندِ بستر ہو جائیں تو اگر اُن میں جسمانی قوت آ بھی جائے تب بھی کچھ دن تک ساتھ نہیں دیتی۔ وجہ یہ ہے کہ قوت کے ایک عرصہ تک معطل رہنے سے طاقتِ عمل کمزور پڑ جاتی ہے۔ ایک تاریک تہ خانہ میں ایک طویل مدت تک رہا جائے تو پھر ہم کو کوئی چیز دکھائی نہ دے گی۔ اس کے بعد روشنی میں آئیں تو معلوم ہوگا کہ وہ روشنی اندھیرے سے بڑھ کر ہے۔ اتنے وقت تک نظر کے معطل رہنے نے بیکاری سے الفت پیدا کر دی۔ اب روشنی میں آتے ہیں تو نظر کام کرنے سے انکار کرتی ہے۔ بلکہ اگر کسی دن معمول سے زیادہ سو رہیں تو جب آنکھیں کھولیں گے دیر تک آنکھیں ملنے کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ شب میں آنکھیں معطل رہیں، کام نہیں کیا، اب کھلی بھی ہیں تو کام نہیں کرتیں۔ یہ عارضی التوا کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے عارضی بیکاری پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اتنی مدت گزر جائے کہ قوت بالکل مصروفِ عمل ہی نہ ہو اور کام کرنا اسے یاد ہی نہ رہے تو یقیناً اب وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی اور کسی صورت سے کام کرنے کے قابل نہ بن سکے گی۔

قوتِ عاقلہ حضرتِ احدیت نے غور کرنے کے لیے دی ہے۔ اگر اسے سوچنے سمجھنے کا حق دینا نہ ہوتا تو وہ سوچنے کی طاقت انسان میں پیدا ہی نہیں کرتا۔ اس نے جبکہ تمام افرادِ جہانی کے اندر انسان کو اس صفتِ خاص کا مالک بنایا تو اس کا کمال نوعی بھی قرار پانا چاہیے کہ وہ اس قوت سے بیش از بیش کام لے اور اس کو معطل و بے کار نہ بنائے۔

دوسرے مذاہب عقل کی کارگذاری اور قوتِ عاقلہ کے صرف واستعمال سے گھبرائیں اس لیے کہ وہ خطرہ کا احساس رکھتے ہیں۔

ان کا عقلی قوتوں پر پہرے بٹھانا خود بتلاتا ہے کہ وہ عقل کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس حریف کی قوت توڑنا اپنا فرض جانتے ہیں۔

پھر ایسے مذاہب ماننے کے قابل کہاں ہیں جو عقل ہی کے ساتھ دشمنی رکھتے ہوں۔ اسلام دنیا میں اس بات کا دعوے دار ہو کر آیا کہ وہ عقل و فطرت کا مذہب ہے اس نے عقل کو خاموش نہیں کیا بلکہ اور بیدار بنایا۔ وہ پکارتا ہے تو صاحبان عقل کو، انصاف کا طالب ہے تو اہل عقل سے۔

دیوانہ اور بالکل فاتر العقل کو تو اس نے اپنے تکالیف ہی سے مستثنیٰ کر دیا۔ اور مرفوع القلم کہہ دیا۔

وہ زمانہ جب زیادہ تر قوائے عقلی ناقص ہوتے ہیں۔ یعنی بچپنے کا دور اس کو اس نے اپنی پابندیوں سے علیحدہ رکھا۔

بلوغ کا وقت جو قوائے عقلی کے بھی مکمل ہونے کا زمانہ ہے اس وقت سے اس نے اپنا پہلا پیغام پہنچایا اور تکالیف متوجہ کیے۔

وہ قرآنی تعلیمات کو رہنما بتلاتا ہے مگر کس کا؟ صاحبانِ عقل کا۔ ان فی هٰذہ تبصرۃ وذکریٰ لاولی الالباب۔

"اس میں آنکھیں کھولنے اور یاد آوری پیدا کرنے کا سرمایہ ہے صاحبانِ عقل کے لیے۔" کہیں ارشاد ہوتا ہے :-

لیدبروا آیاتہ ولیتذکر اولوا الالباب۔

"یہ قرآن نازل کیا گیا اس لیے کہ لوگ اس کی آیتوں میں غور و تدبر سے کام لیں اور صاحبانِ عقل کی یاد آوری ہو۔"

۲۲/۱۲

۲۳/۱۲

کہیں ارشاد ہوا۔ ان فی ھٰذا لعبرۃ لاولی الالباب

"اس میں عبرت حاصل ہونے کا ذریعہ ہے صاحبانِ عقل کے لیے۔"

کہیں لعلھم یعقلون لعلھم یتذکرون وغیرہ الفاظ سے تعقل و تذکر کے مقصد کو آرزو کی صورت میں پیش کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسے حسرت ہے کہ لوگ عقل سے کام لیں۔ غور و فکر کی طاقت کو صرف کریں اور سوچ کر سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے اصول کی کامیابی اسی میں ہے اور وہ اپنی فتح اسی میں مضمر سمجھتا ہے، کہیں وہ آواز دے کر پکارتا ہے اور ارشاد کرتا ہے۔ "یا اولی الالباب" اے عقل رکھنے والو معلوم ہوتا ہے وہ عقل کو صدا دے رہا ہے۔ یہی تو اس کی بات ماننے گی اور اس کے کہنے کی تصدیق کرے گی وہ مذمت کرتا ہے ان لوگوں کی جو آنکھوں سے کام نہیں لیتے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا یہ لوگ آخر قرآن میں غور و فکر سے کام کیوں نہیں لیتے؟ کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں؟ ادھر توریت کی وہ تعلیم کہ نیک و بد کی تمیز حاصل کی اور بس مر گئے ادھر قرآن کی یہ تہدید کہ "آخر تم غور و فکر کرتے کیوں نہیں" اس کے بعد جو لوگ غور و فکر اور عقل و شعور سے کام نہیں لیتے، ان کے لیے ارشاد فرمایا۔ لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا اولٰئک کالانعام بل ھم اضل۔

"ان کے دل تو ہیں سینوں میں مگر قوتِ عاقلہ سے کام نہیں لیتے۔ ان کے آنکھیں تو ہیں مگر دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے، اور ان کے کان تو ہیں مگر قوتِ سامعہ سے کام نہیں لیتے۔ یہ لوگ مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ ان سے بدتر ہیں۔"

یہ تمام چیزیں عطا کی گئی ہیں کام لینے کے لیے، لیکن انسان نے اوہام کے پردوں سے عقل کو چھپا دیا اور تعصب تنگ نظری اور تقلید کورانہ کے ذریعہ سے عقل کے کمالات کو مردہ کر دیا۔

قرآن کہتا ہے۔ فانہا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔ "درحقیقت وہ نابینا ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ کیونکہ ظاہری آنکھوں کا کور ہونا حقیقتاً کور ہونا نہیں ہے۔ بلکہ کور ہونا جو ہے وہ دل کی آنکھوں کا کور ہونا ہے۔"

وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے اور اس کو صحیح طور پر صرف نہیں کرتے ان کے متعلق ارشاد ہے کہ وہ لوگ روز قیامت نابینا محشور ہوں گے۔ ونحشرہ یوم القیامۃ اعمیٰ۔ "ہم ایسے شخص کو روز قیامت اندھا محشور کریں گے۔"

قال رب لم حشرتنی اعمیٰ وقد کنت بصیرا۔ انسان یہ کہے گا کہ کیوں مجھ کو نابینا محشور کیا گیا۔ حالانکہ دنیا میں میں آنکھیں رکھتا تھا تو ارشاد ہوگا کہ "کذلک اتتک آیاتنا فنسیتہا وکذلک الیوم تنسیٰ۔" اسی طرح تم ہماری قدرت کی نشانیاں دیکھتے تھے، تو ان کو بھلاوے میں ڈال دیتے تھے، آج تم بھلاوے میں ڈالنے کے لائق ہو۔"

وہ لوگ جو اپنی گذشتہ رسموں کے پابند ہو گئے تھے اور اپنے آباو اجداد کی سنت پر اس طرح عامل تھے کہ ان کے پاس کوئی دلیل اس کے سوا نہ تھی کہ ہم نے اپنے آباو اجداد کو جس راستے پر دیکھا ہے اسی راستے پر جا رہے ہیں، ان کو قرآن نے سخت الفاظ میں تہدید کی "قالوا انا وجدنا آباءنا علیٰ امۃ وانا علیٰ آثارہم مُہتَدُونَ۔" "وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو جس مسلک پر دیکھا ہے ہم بھی اسی پر چلے جائیں گے۔"

ایک جگہ نتبع ما الفینا علیہ اٰبائنا۔ "ہم بس اسی کا اتباع کریں گے جس پر اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھا ہے"

خالق نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے۔ قل اولو کان اٰباؤکم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون۔ "کیا تم اپنے باپ دادا کے راستہ پر چلے جاؤ گے چاہے تمھارے باپ دادا خود صحیح راستے پر نہ رہے ہوں۔ اور انھوں نے خود عقل سے کام نہ لیا ہو"

درحقیقت انسان کی انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ عقل و غور سے کام لے اور صحیح راستے کی شناخت کرے یہ نہیں کہ ہمارے باپ دادا اس راستے پر تھے اسی لیے ہم بھی ہیں۔ باپ دادا کا اتباع کوئی چیز نہیں ہے ہر انسان کا فرض ہے کہ اپنے ذاتی کانوں سے آنکھوں سے اور عقل سے راستہ معین کرے۔ اس طرح اسلام نے علمی ترقی کے راستوں کو کھولا۔ اور وہ کہ جنھوں نے انسان پر پابندی عائد کی تھی۔ اور کہتے تھے کہ عقل سے کام نہ لو۔ جو کہتے تھے ایمان اور چیز ہے اور عقل اور چیز ہے عقل کو دخل دینا گناہ ہے۔ اگر توحید فی التثلیث ہے تو اس پر ایمان لاؤ، جاننے کی کوشش نہ کرو۔ اگر فدیہ مسیح ہے تو ایمان لاؤ جاننے کی کوشش نہ کرو۔ وہ لوگ وہ ہیں جنھوں نے عقل کو مسدود کرنا چاہا تھا، جنھوں نے عقل کو کور بنانا چاہا تھا۔ اسلام نے یہ تعلیم دی کہ کسی کا قول مذہب کے بارے میں قابلِ تسلیم نہیں ہے۔ یعنی اصول عقائد اس لیے ماننے کے قابل نہیں ہیں، کہ فلاں شخص نے انھیں کہا ہے۔ بلکہ اصول عقائد تمام تر عقل پر مبنی ہیں۔ انسان اپنی عقل سے غور کرے اور صحیح راستہ معین کرے۔ جنھوں نے کہا کہ عقل انسان کو فنا کے درجہ تک پہنچا دے گی۔ انھوں نے انسان کو عقل سے کام لینے سے روک دیا جب نسلیں گزر گئیں تو عقل بھی معطل ہو گئی۔ اور عقل کی قوتیں بھی زائل ہو گئیں۔ اب عقل غور و فکر کرنے پر تیار ہی نہیں ہوتی۔ قرآنِ مجید نے ابتدا ہی سے چھوٹی چھوٹی

مثالیں دے کر عقلِ انسانی کو سمجھایا ہے۔ قرآن شریف کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ادلّہ و براہین پیش کرے۔ اس کے لیے کافی تھا یہ کہہ دینا "مان لو کہ خدا ہے" اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اس نے اصولِ مذہب کو بتایا تو دلائل کے ساتھ۔ ہر قسم کے معیارِ طبع کے موافق کہیں پر خفی، کہیں پر ظاہر، کہیں پر سطحی اور کہیں پر دقیق۔ مختلف افکار و عقول کے معیار کے مطابق دلائل پیش کیے تاکہ ہر شخص اپنی عقل سے غور کرے۔

ارشاد کیا۔ قل انظروا ماذا فی السمٰوات والارض۔ یہ نہیں کہا کہ "تم مان لو" اور بس۔ بلکہ ان سے کہا "تم غور کرو کہ آسمان اور زمین میں کیا کیا حکمتیں اور نشانیاں مضمر ہیں"۔

ارشاد ہوا:۔

ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیی بہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السمٰوات والارض لاٰیات لقوم یعقلون۔

"آسمان و زمین کی خلقت میں، شب و روز کی آمد و رفت میں، ان کشتیوں میں جو سطحِ آب پر انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے چلتی رہتی ہیں۔ اور وہ کہ جسے خدا آسمان سے نازل کرتا رہتا ہے۔ آبِ باراں اس کے ذریعہ سے زمین کو زندہ کرتا ہے اس کے مرنے کے بعد اور ان میں جو اس نے زمین پر پھیلا دیے ہیں حیوانات اور ہوا کے انقلاب میں اور اس ابر میں جو خدا کے اختیار میں ہے نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو عقل سے کام لے۔"

اس نے اپنے رسول، اپنی کتاب بلکہ خود اپنے وجود جس چیز کے اعتقاد کی دعوت دی غور و خوض کے بعد یہی توحید کا مسئلہ تھا۔ اس کو اس طرح روشن بنایا کہ ادھر ادھر جانے کی ضرورت نہیں، جدھر نظر اٹھا کر دیکھو ہماری نشانیاں ہی نظر آئیں گی۔ جو چیز انسان کی نظر کے سامنے آئے اس میں خدا کی نشانیاں دکھلائی دیں گی۔ فرض کیجئے کہ کسی کی نظر کبھی آسمان پر نہیں پڑی، زمین پر نظر نہیں پڑی، کبھی نباتات کو نہیں دیکھا کبھی دریا کی روانی نہیں دیکھی۔ مگر خود تو اپنے پاس ہے خود تو کبھی اپنے سے جدا نہیں ہوتا۔ کسی طرف جانے کی ضرورت نہیں، اپنے نفس پر نگاہ کرے۔ خالق کے دلائل سے اپنی ہستی کو معمور پائے گا۔ لیکن غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے، عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ایک سوال بہت ممکن ہے۔ اکثر اذکار و عقول میں تشویش پیدا کرے وہ یہ ہے کہ آخر دنیا والے جنھوں نے خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کیا، کیا وہ عقل نہیں رکھتے تھے؟ جنھوں نے ہوائی جہاز بنا دیے۔ ریلیں بنا دیں۔ طرح طرح کے آلات ایجاد کیے یہ لوگ کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ اس کے جواب کے لیے سابق میں کہا جا چکا ہے کہ ہر چیز میں کام لینے سے طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اور بغیر کام لیے ہوئے اس میں طاقت نہیں پیدا ہوتی۔ اور جس چیز سے کسی خاص شعبہ میں کام لیا جائے گا۔ بس اسی شعبہ میں اسے طاقت حاصل ہو گی۔ مثلاً انگلیاں، یہ ایک مختصر سا جزو جسم انسانی کا ہیں۔ یہ یا کمزور ہوں گی یا طاقت ور۔ یہ تو بظاہر نہیں ہو سکتا کہ بوقت واحد کمزور بھی ہوں اور طاقت دار بھی، مگر یہ میری انگلیاں ہیں اگر ان میں کسی دن سوئی دے دی جائے سوئی میں انگلیوں کا کام ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ چند ہی منٹ سینے کے بعد میری انگلیوں میں درد پیدا ہو جائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری انگلیاں کمزور ہیں۔ لیکن انہی انگلیوں میں قلم دے دیجیے صبح سے شام تک سامنے کا عذر رہے۔ اور میں لکھتا رہوں، اس میں بھی سینہ، بازو اور پیروں کی طاقت کی ضرورت نہیں ہے

یہ کام بھی انگلیوں ہی کا ہے، یہاں وہی انگلیاں طاقت ور ثابت ہوتی ہیں یہ کیا ہے؟ یہی کہ جس شعبہ میں انگلیوں نے کام کیا ہے اس میں وہ طاقت ور ہیں اور جس شعبہ میں کبھی کام نہیں کیا کمزور ہیں۔ اسی طرح عقل کے بھی شعبے ہیں۔ اہلِ مغرب کی عقل نے مادیت میں کام کیا۔ اس میں ترقی کرتی چلی گئی۔ روحانیت میں کام نہیں کیا۔ اس لیے اس شعبہ میں وہ طفل نومولود کے برابر ہے۔ کیونکہ طاقت ہر چیز کی اس شعبہ کے اعتبار سے ہوتی ہے جس میں اس نے کام کیا ہے۔ کوئی پہلوان اتنا طاقتور ہے کہ بڑے سے بڑے پہلوان کو مغلوب کرلے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر دیر تک تقریر بھی کرلے وہ صرف اپنے ہی شعبہ میں طاقت ور ہے، دوسرے شعبہ میں طاقت جسمانی بھی کمزور ثابت ہوگی اسلام میں عقل سے غور کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ غلط ہے کہ اسلام علم کے حاصل کرنے کے خلاف ہے۔ اگر علم علم ہے اور درحقیقت انکشافِ حقائق کا نام ہے تو جتنا علم دنیا میں ترقی کرتا جائے گا دنیا پر حقائق اسلام منکشف ہوتے جائیں گے۔ اسلام نے تو اپنی بنیاد قائم کی ہے علم کی ترقی پر۔

درحقیقت اسلام کے لیے کفار کو ایمان کے راستے پر لانے میں جو کچھ بھی مشکلات درپیش ہوئے وہ ان کی علمی کمزوری کی وجہ سے اور جتنی کامیابی ہوئی وہ علم کو کام میں لانے سے، وہ جاہل عرب جو اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ کے تابع تھے جو غور و فکر سے کام لینا نہیں جانتے تھے اور جو بات کے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے تھے، ان کے مقابلہ میں اسلام کو کامیابی نہیں ہوئی اس لیے کہ اسلام علم کا حربہ لے کر آیا تھا۔ اسلام تامل و تدبّر کی صلاح سے جنگ کرنے آیا تھا۔ لہٰذا جن لوگوں نے علم سے کام نہیں لیا۔ وہ یہی کہتے رہے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو جس راستے پر دیکھا ہے۔ اس پر چلے جائیں گے اسلام کی کسی بات کو نہ انھوں نے سنا نہ عمل کیا۔ لیکن جن لوگوں نے آنکھیں کھولنے اور دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کی، ان کے سامنے حقیقت اسلام جلوہ گر ہوگئی۔ پھر جب

اسلام نے اپنی بنیاد ہی قائم کی ہے علم کی ترقی پر تو وہ علمی ترقی سے لرزہ براندام کیوں ہونے لگا۔

یہ ہماری کمزوری ہوگی کہ ہم علمی ترقی اور اسلام کے حقائق کو ثابت نہ کر سکیں، ورنہ اسلام کی تو یہی حقیقی جذابیت اور کشش ہے کہ وہ خود علم کی بنیادوں پر مبنی ہے۔ اس وقت مسلمان سو رہے ہیں، وہ تعلیم و تبلیغ کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ لیکن اسلام خود ہی دوسروں کو اپنے دائرہ میں لا رہا ہے۔ اسلام خود ہی اپنا مبلغ ہے۔ خود اپنا ظاہر کرنے والا ہے، خود اپنے محاسن سے دنیا کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ درحقیقت جتنا علم ترقی کرے گا دنیا پر حقائق منکشف ہوتے جائیں گے۔ بے شک وہ علم جو فرائض حیات میں داخل ہے۔ وہ انھی چیزوں کا علم ہے۔ معارف و احکام ربانی سے متعلق ہوں۔ لیکن دنیا میں جو دیگر علوم و فنون ہیں وہ بھی اگر صحیح طور سے ترقی کریں تو ہمیشہ ضمیمہ قرار پائیں گے اسی ایک مقصد کا جو روح اسلام ہے۔ آخر اسلام نے وجود باری کو کس طرح ثابت کیا ہے۔ آثار قدرت ہی کے ذریعہ سے تو؟ خدا کے وجود کو سمجھانے کے لیے اس کے مخلوقات کے محاسن دکھلائے۔ ان کے رموز و اسرار پیش کیے ان میں جو حکمتیں مضمر ہیں ان کے ذریعہ سے بتلایا کہ ان کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے جس طرح ایک تصنیف کے ذریعہ سے مصنف کی جلالت قدر ظاہر ہوتی ہے، اسی طرح آثار قدرت کے ذریعہ سے خدا کا علم و قدرت ثابت ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اگر کوئی ایک تصنیف ہمارے سامنے پیش ہو، اس وقت جب ہمارا علم کم ہے تو اس کے ظاہری پہلو کو ہی ہم سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں جو باریکیاں ہیں انھیں ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ہم اس تصنیف کے صرف ایک حد تک قدر شناس قرار پائیں گے لیکن جیسی جلالت مصنف کی اس تصنیف کے ذریعہ سے حقیقتاً ثابت ہوتی ہے اسے ہم نہیں سمجھ سکے۔ اور اگر کوئی شخص ایسا ہو جسے اس تصنیف کی اندرونی باریکیوں

کا اس کے تمام مطالب اور واقعی ترکیب ساخت کا اندازہ ہو تو مصنف کی قدر
اس کی نظر میں زیادہ ہونا چاہیئے۔ یونہی سمجھنا چاہیئے کہ پہلے دنیا موجوداتِ عالم
کے باریک پہلوؤں سے بالکل بے خبر صرف ظاہری آثار کو دیکھنے والی تھی۔ مذہب
نے اس کے اتنے ہی علم اور اتنے ہی معارف سے جو ظاہری آثار کے متعلق تھے ان
میں خالق کی معرفت پیدا کرنے کے لیے فائدہ اٹھایا اور ان آثار کے ذریعہ سے اس
کے کمالِ حکمت سے دنیا کو روشناس کرایا۔ اب اگر دنیا علمی ترقی کرے اشیاء کے رموز و
اسرار زیادہ منکشف ہوں اور ان کی باریکیاں کھلتی جائیں تو یہ خالق کی حکمت کو زیادہ
نمایاں کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک وقت ایسا تھا کہ ہم دنیا کے سامنے یہ پیش
کرتے تھے کہ دیکھو خدا نے ایک مختصر سے مختصر حیوان یعنی مچھر میں وہ تمام اعضاء و
جوارح ودیعت کیے ہیں جو عظیم الجثہ ہاتھی میں موجود ہیں۔ بلکہ اس مچھر میں پرواز کے لیے
دو پروں کا اضافہ ہے، کیا کہنا اس نقاش کے اقتدار کا جو کبھی اتنے وسیع صفحہ پر ان ہی
نقوش کو بناتا ہے اور کبھی اتنی مختصر سی جگہ پر اس تمام دنیا کو سمیٹ دیتا ہے پیش کرتے تھے
اور خدا کی حکمت و قدرت کو اس طرح سمجھاتے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں اس مثال کی
طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان اللہ لا یستحیی ان یضرب مثلاً ما بعوضۃ فما
فوقھا فاما الذین امنوا فیعلمون انہ الحق من ربھم۔
"خدا کو اس بات میں شرم نہیں آتی کہ وہ مچھر کو مثال میں پیش کرے یا اس سے
بھی زیادہ چھوٹی چیز جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس میں رموز و حقائق
جلوہ گر ہیں۔"
بے شک اس مختصر ذی روح کو دیکھنے سے اس کے خالق کے کمال پر حجت
قائم ہوتی ہے لیکن اگر دنیا کی تحقیقات ایک ایسے نقطہ تک پہنچ جائے کہ وہ
مچھر سے بھی زیادہ مختصر، باریک سے باریک تر مخلوق کا پتہ چلا لے جو ذی حیات بھی ہو

اور پانی کے ایک ایک قطرہ میں جس کے سینکڑوں افراد موجود ہوں، وہ کونسا قلم تھا جس
نے اس مختصر ہستی میں یہ سب کچھ ودیعت کر دیا۔ جو ایک جاندار اور ذی حیات کے لیے
ضروری ہے تو یقیناً اس کی حکمت اور زیادہ منکشف ہو گی۔ ایک وقت تھا کہ انسان
خود اپنے اندرونی جسم کے آثار کو نہیں جانتا تھا کہ ہمارے کون سے اجزاء کس مقصد
کے لیے ہیں مگر اب وہ زمانہ ہے کہ انسانی اجزاء کے اکثر خواص و فوائد ظاہر ہو گئے۔
اس سے ظاہر ہے کہ یہ علوم جتنی ترقی کرتے جائیں اس بنانے والے کی حکمت کی اور بھی
زیادہ وضاحت کریں گے جس کی تبلیغ کے لیے قرآن آیا ہے۔

یہ چیزیں خدا کے اعتقاد سے الگ کیونکر کرتی ہیں؟ اس کا رمز ایک دوسرا ہے
وہ یہ ہے کہ اگر کسی چیز کو دیکھا جائے تو انسان کا نقطۂ خیال نتیجہ کو بدل دیتا ہے
ایک آئینہ آپ اپنے سامنے لائیے، اپنے چہرہ کے دیکھنے کے لیے۔ اب آپ اس
کو جتنا زیادہ دیکھیے گا، چہرہ کے خط و خال زیادہ نمایاں ہوتے جائیں گے۔ لیکن اسی
آئینہ کو اپنی نظر کے سامنے لائیے صرف آئینہ کی ساخت کو دیکھنے کے لیے۔ اس وقت
آپ کو اس کا خیال بھی نہ ہو گا کہ آپ اپنے چہرہ کو دیکھیں۔ کیونکہ اس وقت تو دیکھنا یہ
منظور ہے کہ آئینہ۔ کیسا بنا ہے۔ آئینہ کے موجودہ خصوصیات کا دیکھنا مدِ نظر ہے
اب آپ آئینہ کی ساخت ہی کی تعریف کیجیے گا۔ اس کے خاص جوہر محسوس
کیجیے گا۔ چہرہ میں کوئی دھبہ ہے تو وہ اس نگاہ سے نظر نہیں آئے گا۔ حالانکہ نظر آئینہ
ہی پر اور آئینہ چہرہ کے سامنے ہے۔ لیکن نظر چونکہ چہرہ پر نہیں اس لیے چہرہ نظروں
سے اوجھل رہا۔ حالانکہ وہ نمایاں ہے ضرور کیونکہ وہ اس کا لازمہ طبعی ہے مگر التفات
نفس نہ ہونے کی وجہ سے نظر بے نتیجہ ہو گئی۔ مقصد جو آئینہ کا تھا بحیثیت "آئینہ" وہ
حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ جسمانی حیثیت کے اعتبار سے مقصد حاصل ہوا۔ یہ ہی صورت
ان حقائقِ قدرت کی ہے۔ ان مصنوعات میں ایک ان کی طبعی اور مادی حیثیت ہے

اور ایک وہ روشنی ہے جو اُن سے پڑتی ہے ان کے خالق کے وجود پر۔ انسان کی نگاہ اگر آئینہ کے ذاتی حسن وجمال میں ایسی محو ہوئی کہ وہ اسی میں الجھ کر رہ گئی، تو وہ اس حقیقت کو نظر میں نہیں لاتی۔ جو اس میں مضمر ہے۔ آج یہی صورت ہے کہ انسان اپنے مادی خواہشات میں ایسا الجھا ہے کہ وہ اس روشنی کو دیکھتا نہیں۔ جو موجودات قدرت میں نمایاں ہے۔ اس نے ان چیزوں کو دیکھا اور بہت غور سے دیکھا مگر ان کے طبعی خواص پر نظر کر کے دیکھا اس لیے وہ جمال مخفی رہا جو ان میں مضمر تھا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو حکیم امت، مدینۃ العلم، نبض شناس مزاج انسانی، مزاج دان فطرت بشری یعنی امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے، دنیا کے وصف میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

من ابصر بھا بصرتہ ومن ابصر الیھا اعمتہ۔ ایک مختصر سا کلام ہے مگر اس میں وہ سب ہے جو میں نے اپنے طویل الذیل بیان میں کہا۔

ارشاد ہوتا ہے، جو شخص اس دنیا پر خاص طور سے نظر ڈالے تو اسے یہ دنیا اندھا کر دے گی، مگر جو اس عینک کو لگا کر دیکھے۔ اس دنیا کو ذریعۂ مشاہدہ قرار دے تو اس کی یہ دنیا آنکھیں کھول دے گی۔ اور بصارت کا باعث ہوگی۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ جب دنیا کو مقصدِ اصلی بنا کر جو اسلام کا مقصد ہے حاصل نہ ہوگا۔ لیکن اگر آپ علمی ترقی کیجیے سائنس کو بڑھائیے اس میں اضافہ کرتے رہیے مگر شروع سے نگاہ خالق پر رہے تو جتنا جتنا سائنس میں ترقی کریں گے، اتنا ہی منزلِ معرفت زیادہ سامنے آتی جائے گی۔ یہ علوم جتنا ترقی کرتے ہیں درحقیقت سرمایہ مہیا کرتے ہیں حقائق اسلام کے منکشف کرنے کا، بس فقط اُدھر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے تحقیقات جاری رہے سائنس ترقی کرتا جائے۔

ابھی تو وقتی حیثیت سے یہ خدا کے وجود کی طرف سے ہٹا رہا ہے یا کم سے کم اقرار پر آمادہ نہیں کرتا، لیکن ایک ذرا نقطۂ نظر بدل جائے تو تمام سائنس کے کشادرکس کے

تحقیقات خدا کے ماننے کا ذریعہ بن جائیں گے۔ ایک وقت انسان ظاہری شکل کو دیکھتا تھا حیرت کرتا تھا کہ اس میں یہ رموزِ قدرت ہیں لیکن اب اس تصور کا موقع ہے کہ وہ کتنا باریک نظر نقاش ہے۔ کہ اتنے سے مختصر انگوٹھے ہیں جس کے نقش ہماری نظر کو پورے طور سے دکھلائی بھی نہیں دیتے اس نے ایسے نقوش بنائے ہیں جو کبھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہیں۔

یاد رکھیے کہ دنیا ایمان لائے ہوئے ہے اس صنعت، اس کے استحکام اور اس کے ناقابلِ تبدیل ہونے پر۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے قادر کے قائم کیے ہوئے نقوش ہیں جس کا ہاتھ کبھی دھوکا نہیں کھاتا اور جس کے قلم میں کبھی لغزش نہیں ہوتی۔ اس لیے اس کے بنائے ہوئے نقوش اور ان کے استحکام پر اتنا اعتماد ہے کہ مُہر اتنی معتبر نہیں اور دستخط اتنے معتبر نہیں کیونکہ وہ بنائے جا سکتے ہیں مگر یہ نقوش معتبر ہیں اس لیے کہ ان کا بس ایک ہی بنانے والا ہے۔ اور وہ ایسا کہ اس کا قلم کبھی چوکتا نہیں۔ یہ کب منکشف ہوا؟ اسی وقت کہ جب علم تشریح نے ترقی کی۔ جب سائنس دنیا کے سامنے آیا پھر کیوں نہ یہ یقین کیا جائے کہ جتنا سائنس ترقی کرتا جائے گا خدا پر ایمان اور زیادہ ہوتا جائے گا۔

اسلام اور حرّیتِ عقل

دنیا کے وہ مذاہب انتہائی کمزور ہیں جن میں تحقیق کو خطرہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جنھوں نے اپنے مذہبی عقائد کے سلسلہ میں پردہ پوشی سے کام لیا ہے۔ اپنے حلقہ بگوشوں کے لیے جرم قرار دے دیا ہے کہ وہ مذہبی گفتگو کریں۔ یہ کیا ہے؟ انھیں اپنے مذہب کی اصلی بنیادوں کے کمزور ہونے کا احساس ہے۔ لہٰذا وہ جانتے ہیں کہ ادھر گفتگو ہوئی ادُھر شیشۂ عقائد پر سنگِ اعتراضات کی بارش ہوئی۔ عیسائی مذہب جو تبلیغ میں شدت کے ساتھ مصروف ہے دنیا جانتی ہے کہ اس کے تمام رہنماؤں کا یہی طرزِ عمل رہا کہ ان کی اصل مذہبی کتابیں دوسروں کے ہاتھوں تک نہ جانے پائیں۔ چند خاص افراد تھے جن کے پاس مذہبی کتابیں محدود رکھی جاتی تھیں۔ کسی کو حق نہ تھا کہ وہ مذہبی کتابوں کو دیکھ سکے۔ جب نہ دیکھے گا ہی نہیں تو رائے کیا قائم کرے گا۔ لطف یہ ہے کہ آج بابی یا بہائی مذہب جس کے ماننے والے اس کو انیسویں بیسویں صدی کا رہنما قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے تعلیمات جدید ظرف زمانہ کے مطابق ہیں اس کی کتابوں میں بھی یہ حکم موجود ہے کہ:۔

کور شو تا جمالِ من بینی

کر شو تا صدائے من بشنوی

"اندھے ہو جب ہماری حقیقت کا جلوہ تم کو دکھائی دے گا بہرے ہو جاؤ تب جا کر ہمارا کلام تم پر اثر کرے گا۔"

یہاں یہ تعلیم ہے، مگر اسلام جو تیرہ سو سال سے زیادہ ہوئے جب سے اپنے

واحد ہونے کا اظہار کر رہا ہے وہ اندھوں کی مذمت کرتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

من کان فی هٰذه اعمی فهو فی الآخرة اعمی واضلّ سبیلاً

"وہ اندھا ہونے کو نہیں کہتا بلکہ یہ کہتا ہے کہ آنکھوں سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے وہ بہرا ہونے کو نہیں کہتا بلکہ وہ کانوں پر سے پردے ہٹنے کو کہتا ہے"، وعلیٰ ابصارهم غشاوةٌ "ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔"

درحقیقت اسلام صحیح تعلیم کو ترقی دینا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ حقائق کائنات دنیا کے سامنے منکشف ہوں، عقل وہی عقل جس کو بہت سے لوگوں نے اپنے لیے انتہائی خطرناک سمجھ لیا۔ اس کے لیے معلم اسلام کا ارشاد ہے من لا عقل له لا دین له "جس کے لیے عقل نہیں اس کے لیے دین نہیں" اس کے معنی یہ ہوئے کہ دین کی بنیاد عقل پر قرار دی گئی۔

یہ ارشاد ہوا کہ:۔

العقل ما یرضی به الرحمٰن ویکتسب به الجنان "عقل وہ ہے جس کی وجہ سے خدا کی خوشنودی کا سامان کیا جاتا ہے اور جس سے انسان باغ بہشت کا مستحق بنتا ہے"

یہ دنیا کی کوتاہ نظری ہے کہ اس نے عقل کو حیلہ بازی قرار دے لیا۔ ان معنوں سے اگر عقل کو غلط استعمال کیا جائے تو وہ عقل ہے ہی نہیں وہ شیطنت ہے۔ عقل تو خیر محض ہے، عقل تو خدا کی حجت ہے، عقل کو خدا نے اپنی طرف سے سفیر بنایا ہے عقل! اگر درحقیقت عقل ہو تو وہ معصوم ہے، خطا سے منزہ ہے لیکن جس طرح غلط دعویداران نبوت بھیس بدل کر انسان کو گمراہ کرتے ہیں اسی طرح قوتِ واہمہ عقل کا

لباس پہن کر انسان کے سامنے آتی ہے۔ عقلاء کے اقوال میں اختلاف ہوتا ہے لیکن یہ نہ سمجھیے کہ ان کے اقوال میں سے ہر قول مطابق عقل ہی ہوتا ہے۔ عقلاء اختلاف رکھتے ہیں لیکن درحقیقت عقل ان میں سے ایک ہی کی مؤید ہوتی ہے۔ اور ان دوسرے اقوال سے بیزار ہے، پھر وہی مختلف اقوال میں فیصلہ کرنے والی ہوتی ہے۔

ایک قیاس یعنی عقلی دلیل کی مرتبہ شکل میں عقل ہی غلطی کی گرفت کرتی ہے، عقل رہنما ہے مگر پردہ میں ہے" اس لیے ہر مکار عقل کا لباس پہن کر انسان کے سامنے آتا ہے اور گمراہ کرتا ہے لیکن عقل اپنے فیوض باطنی سے حیلہ بازی کا پردہ چاک کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ دلیل یہاں سے باطل ہے۔ اصول مذہب درحقیقت تمام تر عقل پر مبنی ہیں، ایسا نہ ہوتا تو خدا کے وجود پر ایمان کس طرح لاتے، قرآن میں دیکھ کر کہ خدا ہے ایمان لاتے؟ مگر جب تک خدا کا وجود ثابت نہ ہو، قرآن کیسا! پھر خدا کے وجود پہ اگر ہم ایمان لائیں تو سوا اس کے کہ عقل کے دامن کو تھامیں اور کس طرح ایمان لاسکتے ہیں؟ رسولؐ کی رسالت پر ایمان لانا چاہتے ہیں تو کیا خود ان کے ہی کہنے سے ان پر ایمان لائیں؟

درحقیقت سب سے پہلی تصدیق کرنے والی رسالت کی عقل ہے، اگر عقل نہ ہوتی تو انبیاء اور رسل کی آوازیں پکارتے پکارتے تھک جاتیں، ان کی صدائیں خاموش جاتیں اور دنیا سننے پر مجبور نہ ہوتی۔ لیکن عقل ہی وہ چیز ہے جو لاتی ہے دنیا کو رسولؐ کی آواز کی طرف۔ اسی طرح دنیا کی ہر حقیقت ہمیشہ عقل سے ثابت ہوتی ہے غلط ہے، ان کا قول جو کہتے ہیں کہ ہم اپنے معلومات کی بُنیاد احساس پر رکھتے ہیں۔ احساس کبھی انسان کو حقیقت تک نہیں پہنچا سکتا، جب تک عقل کا قدم درمیان میں نہ ہو۔

بجلی کا پنکھا جس وقت تک وہ ساکن ہے اس میں تین پر نظر آئیں گے۔ لیکن جس وقت وہ حرکت کرنے لگے گا تو اب وہ ایک واحد طبق دکھائی دے گا، اگر صرف احساس پر ہم اپنے عقیدہ کی بنیاد قرار دیں تو سمجھنا پڑے گا کہ شکل میں تبدیلی واقع

ہوگئی۔ جو چیز تھی وہ فنا ہوگئی۔ اب دوسری چیز ہوگئی۔ پہلے تین پر تھے۔ اب نہ معلوم کس طرح ان میں اتصال ہوگیا۔ لیکن عقل ہی ہے جو اس راز کو منکشف کرتی ہے کہ اب بھی وہی تین پر ہیں جو پہلے تھے۔ لیکن حرکت کی سرعت کی وجہ سے چونکہ اس کے وجود کا ایک جزء خیال سے نہیں مٹنے پاتا کہ دوسرا اس کی جگہ آجاتا ہے، دوسرا نہیں مٹنے پاتا کہ تیسرا اس کی جگہ آجاتا ہے لہٰذا وہ سب ایک ہو کر شکل ایک طبق کی پیدا کرتے ہیں مگر ہیں وہی تین پر جو پہلے تھے۔ یہ ہماری نظر کا پھیر ہے کہ ہم کو ایک طبق دکھائی دیتا ہے یہ حقیقت کا انکشاف عقل نے کیا۔

ایک انسان کو آپ ایک بلند منارہ پر سے جاکر دیکھیے تو وہ چھوٹا نظر آئے گا۔ وہاں سے اُتر آئیے نیچے کی سطح پر تو اب کچھ بڑا معلوم ہوگا۔ جب بالکل قریب سے دیکھیے گا تو اتنا ہی نظر آئے گا جتنا آپ عام طور پر اسے دیکھا کرتے ہیں۔ اگر ہم صرف نظر ہی پر اپنی بنیاد قرار دیں تو ہم کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ آدمی بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے۔ اس وقت وہ چھوٹا تھا، اب بڑا ہوگیا۔ لیکن عقل حقیقت کا انکشاف کرتی ہے۔ عقل یہ کہتی ہے کہ نہیں! یہ جتنا تھا اتنا ہی اب بھی ہے لیکن شرائط رویت کی بنا پر مسافت ایک خاص معیار پر اگر ہے تو وہ اس شئے کو اتنا ہی دکھلائے گی جتنی وہ ہے لیکن اگر مسافت میں کچھ بُعد پیدا ہو جائے تو جتنی وہ ہے اس سے چھوٹا دکھائے گی، شے ایک ہی رہتی ہے لیکن نظر کا پھیر ہے جو چھوٹا اور بڑا بناتا ہے۔ یہ کس نے انکشاف حقیقت کیا؟ عقل نے کیا حالانکہ ہماری حس دھوکہ کھا رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ جتنے حسیات ہیں ان میں واقعیت کی شناخت عقل ہی پر ہے لیکن یاد رہے کہ عقل وہیں تک کام کرتی ہے جہاں تک وہ خود کام کرنے کی مدعی ہے۔ لیکن اگر کسی جگہ عقل خود حکم لگائے کہ یہ میرا شعبۂ عمل نہیں ہے۔ وہ خود کہے کہ اس میں میرا بس نہیں ہے تو وہاں عقل سے کام لینا خود عقل ہی کے فیصلہ کے خلاف ہوگا۔ اس لیے اس سے کام لینے کے بعد اگر بظاہر آپ کی عقل کسی نتیجہ تک

پہنچائے تو وہ نتیجہ بھی عقل کا نتیجہ نہ ہوگا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اصولی عقائد بے شک وہ ہیں جو تنہا عقل ہی کے ذمہ ہیں۔ ان اصولی عقائد اور مذہب کی بنیادوں کو عقل سے سمجھنا چاہیے لیکن مذہب کے فروع اس کے قوانین و قواعد اور عملی احکام میں یہ ضروری نہیں ہے کہ عقل ہر صحیح نقطہ تک پہنچ جائے۔ اس لیے کہ عقل نے رسولؐ کی رسالت کو اسی لیے ضروری سمجھا ہے کہ انتظام بشری اور نظام اجتماعی کے لیے ایک قانون اور آئین ایک ایسی ہستی کا بنایا ہوا ہونا چاہیے جو تمام افرادِ بشر کی صحیح مزاج داں ہو اور جو نظام انسانی سے صحیح طور باخبر ہو۔ رسولؐ کی ضرورت کے عقلاً ثابت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جزئی قواعد کے سمجھنے کے لیے عقل انسانی کافی نہیں ہے اور نہ رسولؐ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ عقل ہر شخص کے دماغ میں موجود ہے وہ خود ہی ایک لائحہ عمل بنا لیتی۔ لیکن عقل اس وادی میں آکر عاجز نظر آتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص کی عقل اس کے ذاتی حالات کا جائزہ لے بھی سکتی ہے۔ مگر عقل انفرادی، اجتماعی حیثیت سے بصیرت کی حامل اس وقت ہو سکتی ہے کہ جب نظام عالم میں جتنے اجزا داخل ہیں ان سب پر کسی عقل کو عبور حاصل ہو۔ اس لیے کہ قانون ایسا ہونا چاہیے جو تمام اجزائے عالم کے مناسبات سے، تمام افراد کے معیار طبع خصوصیات شخصی و اجتماعی اور ہر شخص کے مصالح و حکم کے لحاظ سے مجموعی طور پر جن کا لحاظ ضروری ہو بنایا گیا ہو مگر کسی انسان کی عقل انسانی حدود میں کبھی اس کی دعویدار نہیں ہو سکتی کہ وہ تمام افراد کے خصوصیات جزوی و اجتماعی کی پورے طور سے عالم ہے اور جب وہ پورے طور سے واقف نہیں تو وہ کوئی قانون بھی ایسا نہیں بنا سکتی جو بوقت واحد تمام عالم کے انتظام کے لیے کافی ہو چونکہ عقل حق شناس ہے۔ اس لیے وہ اپنی کمزوری کو بھی جانتی ہے اور اپنے درجہ و منزلت کو سمجھتی ہے اور اسی لیے قانون کی ساخت کے لیے ضرورت سمجھتی ہے ہے معلم قدرت کی کہ اس کا بتایا ہوا قانون تمام افرادِ انسانی کے انتظام کے لیے کافی ہوگا۔ جب عقل نے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا تو پھر اب عقل کو کیا حق ہے کہ وہ جزئی باتوں

میں پوچھے کہ یہ کیوں ہے اور یہ کیوں؟ جب عقل رسولؐ کی ضرورت مان چکی اور معیارِ رسالت بھی عقل کے ذریعہ سے طے ہوگیا اور ایک شخص میں وہ معیار قطعی طور پر ثابت بھی ہوگیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خدا کی طرف سے رسول ہے اور اس کا قانون خدا کی طرف سے ہے۔ اب اس نے کہا ہے کہ "مغرب کی تین رکعتیں ہیں" "ظہر کی چار رکعتیں" تو اب اس پر عمل کرنا عقلاً اس لیے ضروری ہے کہ یہ اس کے احکام ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بادشاہ ہے، اس کے ارکان حکومت کے لیے عقل یہ ضروری سمجھتی ہے کہ وہ جب اس کے دربار میں جائیں تو آداب دربار پر عمل کریں اور رسوم دربار کو اپنے پیش نظر رکھیں۔ کسی نے اگر رسم دربار کے خلاف کیا اور حکم عدولی کی تو اس کو سزا دی جانا چاہیے۔ لیکن آداب و رسوم دربار کیا ہیں؟ اسے عقل طے نہیں کرے گی، بلکہ وہ خود بتاتی ہے کہ یہ آداب و رسوم خود اس حاکم کی قرار داد سے تعلق رکھتے ہیں جو رسوم وہاں سے مقرر ہو جائیں انہی کی تعمیل لازم ہے۔

بے شک چونکہ عقل کے فیصلہ کے مطابق حضرت احدیت حکیم علی الاطلاق ہے اور اس کا کوئی فعل حکمت و مصلحت کی حد سے باہر نہیں جاتا اس لیے جو حکم وہ دیگا چاہے وہ عبادات سے تعلق رکھتا ہو اور چاہے معاملات سے، اس میں کوئی نہ کوئی خاص حکمت و مصلحت ضرور مضمر ہوگی۔ ہم وہ نہیں ہیں جو یہ کہیں کہ حکم الٰہی میں کوئی مصلحت نہیں ہوتی اور اگر خدا چاہے تو بری بات کا حکم دے دے وہ اچھی ہو جائے گی حکم کی وجہ سے۔ خدا کو کسی مصلحت پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہم کہتے ہیں کہ ہر چیز میں حکم و مصالح ضروری ہیں، مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی حکم جو حضرت احدیت کی طرف سے آئے اور ہمارے لیے ثابت ہو جائے تو ہمیں مجمل طور سے سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ حکم نہ ہوتا، مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مصلحت ہماری عقل سمجھ بھی لے۔ اس لیے کہ عقل مخلوق اور

حکمتِ خالق میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری عقل کبھی قاصر بھی رہتی ہے بے شک میں نے یہ کہا ہے کہ عقل معصوم ہے۔ یعنی غلط حکم نہیں لگاتی۔ لیکن ہر جگہ حکم لگاتی بھی ہے۔ اور سمجھ بھی لیتی ہے؛ ایسا نہیں ہے، جہاں عقل نہیں سمجھتی وہ خود کہہ دیتی ہے کہ میں نہیں سمجھتی۔ جہاں قاصر رہتی ہے کہہ دیتی ہے کہ میں قاصر ہوں۔ یہ اس کی سچائی ہے اور یہی اس کی عصمت ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عقل انسان ہر بات کو سمجھ لیتی ہے اگر ایسا ہوتا تو علم ترقی کیونکر کرتا؟ اس کی ترقی یونہی ہوتی ہے کہ بعض باتیں پردۂ خفا میں تھیں جو بعد میں ظاہر ہوئیں۔ ایسے ہزارہا رموز تھے جو ایک زمانہ میں انکارِ عقلی سے منفی تھے۔ اب علمی ترقی نے ان اسرار کو منکشف کیا۔ باوجودیکہ دنیا انتہائی مدارجِ کمال پہ علمی حیثیت سے پہنچ گئی ہے مگر آج کے انسان کا کمال یہی ہے کہ اب سمجھنے لگا ہے کہ ہم ابھی کم سمجھے ہیں علمی انکشافات کرنے والے خود اب اس کا اقرار کرتے ہیں کہ آئندہ جو معلومات منکشف ہونے والے ہیں۔ وہ ایسے ہوں گے جن کے مقابلہ میں اس وقت تک کے معلومات ہیچ ہو جائیں گے۔ ایک بہت بڑا سمندر کا پاٹ ہم کو طے کرنا باقی ہے۔ اگر زمانہ مستقبل میں حالات مساعد ہوئے تو ممکن ہے کہ ہم اس سمندر کے وسط تک پہنچ جائیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اب تک انسان کی عقل سے پوشیدہ رہی ہیں خیر دنیا اب سمجھی ہے کہ ابھی تک ہم کم سمجھے ہیں اور وہ جو بتلانے والا تھا اس نے پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا۔ ما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

یہ علمی ترقی، یہ علمی انکشافات جو روز بروز ہوتے رہتے ہیں خود یہ دلیل ہیں اس بات کی کہ ہم ابھی تک ناقص ہیں۔ کمال کے بعد کوئی درجہ ترقی کا نہیں رہتا روز بروز جدید معلومات کا حاصل ہوتے رہنا بتلاتا ہے کہ ہماری عقل ابھی کم سن ہے ابھی نشو و نما اور بڑھنے کا زمانہ ہے۔ پھر ان نو عمر عقلوں پر ہم اس خدائے حکیم کے احکام کے تمام رموز کو سمجھ لینے کا دعویٰ کریں جو ازل سے ابد تک ہر چیز پر محیط ہے اسکے

علم میں تدریج نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ پہلے نہیں معلوم تھا اب معلوم ہو گیا جب ہمارا
علم محدود ہے تو ہمیں کیا حق ہے اس دعوے کا کہ ہم تمام اسرار رموز خود سمجھ لیں گے۔ بیشک
یہ علم کی ایک خامی ہو گی کہ ہم رموز و اسرار کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ اسی لیے آثار قدرت
میں غور اور اس کے احکام میں تامل و فکر ممنوع نہیں ہے لیکن احکام الٰہی کی پابندی کو
ان کی مصلحت کو سمجھ لینے پر موقوف کرنا غلط ہے۔ پابندی اس لیے کرنا چاہیے کہ خدا کا حکم ہے
اور غور اس لیے کہ حکم دینے والا حکیم علی الاطلاق ہے اگر ہم اس کی مصلحت کو سمجھ لیں، تو
ایک علمی ترقی ہے۔ اسی لیے ائمہ معصومینؑ نے علل شرائع بیان کیے ہیں۔ قرآن مجید
میں بھی بہت سے احکام کے ساتھ ان کے حکم و مصالح بھی بیان کیے گئے ہیں۔ یہ
سب اسی لیے ہے کہ ایک طرف ہم عملی حیثیت سے پابند ہوں، دوسری طرف علمی ترقی
کے لیے کرنا چاہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

ہمارے بہت سے روشن خیال حضرات احکام کے اسرار کو علماء سے پوچھا کرتے
ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ علماء خالق کے احکام کے اصلی رموز و مصالح سے اسی طرح
بے خبر ہیں جس طرح دوسرے افراد۔ اگر فرق ہے تو اصل احکام کے جاننے اور نہ
جاننے میں ہے لیکن احکام کے رموز و مصالح ان میں ہم مساوی حیثیت سے بے خبر ہیں
ہاں چونکہ کچھ نہ کچھ علماء کی نظر احادیث پر بھی ہے ممکن ہے کہ مختلف قسم کے نظائر کے
دیکھنے سے ان کا ذہن بہ نسبت دوسرے اشخاص کے جلد پہنچے لیکن بحیثیت ایک
انسان ہونے کے خالق کی حکمت سے مخلوق کو کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

بے شک علمی حیثیت سے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ احکام پر غور کیا جائے۔ اس
لیے کہ اسلام دنیا کو علمی ترقی میں آگے بڑھانے کا علم بردار ہے، اس کا اعلان ہے، کہ
عقل نہ ہو تو عبادت ناقص ہے۔ اس لیے کہ عبادت میں روح پیدا ہوتی ہے۔ نیت
کی وجہ سے الاعمال بالنیات اور عقل جتنی کامل ہو گی نیت میں بہت کمال زیادہ

پیدا ہو سکے گی۔ اسی لیے اصول کافی کی ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایک عابد کا جو ایک جزیرہ میں رات دن عبادتِ خدا میں بسر کرتا تھا اس کی عبادت کے تناسب سے اجر کم ملا۔ اس وجہ سے کہ اس کی عقل کم تھی۔

جنابِ رسالت مآبؐ فرماتے ہیں۔ فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم۔ "عالم کی فضیلت عابد پر اتنی ہے جتنی ایک نبی کو فضیلت ہوتی ہے ایک فردِ اُمت پر۔"

اس طرح علم و عقل کے معیار کو بلند کیا گیا۔ اور علمی ترقی کا دروازہ کھولا گیا۔ طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم۔ "علم کا طلب کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔ "خدا کا خوف اگر کسی کے دل میں پیدا ہوتا ہو تو وہ وہی لوگ ہیں جو علم کے رکھنے والے ہیں۔" ارشاد فرمایا:۔ لا یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔ "کبھی برابر نہیں ہو سکتے وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں۔ اور وہ جو علم نہیں رکھتے۔" ارشاد فرمایا۔ افمن جعلنالہ نوراً یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منھا کیا وہ شخص جس کے لیے ہم نے نور قرار دیا ہے جس کی شعاعوں میں وہ راستہ طے کرتا ہے اس کے مثل ہو سکتا ہے کہ جو تاریکی میں ادھر اُدھر ہاتھ پیر مار رہا ہو۔"

لا یستوی الاحیاء ولا الاموات۔ یہ علم و جہل کی مثال ہے۔ علم کو حیات قرار دیا۔ اور جہل کو موت۔ ان الملائکۃ لتضع اجنحتھا لطالب العلم۔ جو علم کے راستے میں چلتے ہیں ملائکہ ان کے پیروں کے نیچے پر بچھاتے ہیں۔ تستغفر لھم الحیتان فی الماء والطیر فی الھواء۔ "ان کے لیے مچھلیاں دریا میں اور طائر ہوا میں استغفار کرتے ہیں۔"

درحقیقت اسلام ہی دنیا کا وہ مذہب ہے جو صحیح طریقہ سے دعویٰ کر سکتا

ہے کہ اس نے دنیا کو علم کے راستہ پر چلنے کی بحیثیت مذہب کے دعوت دی۔ دنیا کے مذہب کے ذرہ ذرہ کو چھان ڈالیے مگر آپ کو علم کی اتنی حمایت نہ ملے گی جتنی قرآن اور حدیث میں ملتی ہے اس طرح اسلام، دنیا میں علمی ترقی کا جس طرح صحیح رہنما بنکر آیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی مذہب نہیں آ سکتا۔

اسلام اور عملی ترقی

دنیا میں افراد انسانی نے امتیاز باہمی کے معیار قائم کر لیے تھے۔ مادہ پرست دنیا مال و دولت کو سببِ افتخار سمجھتی تھی۔ سلطنت و حکومت کو سببِ عزت سمجھتی تھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو کسی بڑے کی طرف انتساب کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے۔ گورے رنگ والے کالے رنگ والوں کو ذلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کسی خاص شخص کی اولاد میں ہونے والے دوسری نسل والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہی چیزوں نے کمالات انسانی کو خاک میں ملا دیا تھا۔ انفرادی ترقیوں کے راستوں کو بند کر دیا تھا۔ اس لیے جو شخص وقار حاصل کرنا چاہے اس کو انہی چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک عزت کا طالب مال و دولت کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ سلطنت حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جو لوگ ایسے تھے کہ انھیں قدرت نے کسی خاص خاندان میں پیدا کر دیا تھا۔ ان کو تو یہ عزت بغیر کسی محنت کے حاصل تھی۔ نہ کہیں فوج کشی کی ضرورت تھی اور نہ محنت و مشقت کے برداشت کرنے کی حاجت۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا اپنے نفوس کو اخلاق سے سجنے کی طرف متوجہ نہ ہوتی کسی کو اسکی ضرورت نہ محسوس ہوتی کہ وہ اچھا آدمی بنے تاکہ اس کی تعظیم کی جائے۔ ایک یہ چیز تھی جو قوتِ عمل کے کمزور کرنے کا باعث تھی۔ دوسرے مذہب کے غلط نظریات جو قائم کیے گئے تھے جیسے نصاریٰ کا عقیدہ "فدیہ" کہ مسیح سولی پر چڑھ گئے لہٰذا ہمارے تمام گناہوں کے ذمہ دار بن گئے اور اب ہمارے لیے کوئی حکم نہیں ہے ہم آزاد ہیں۔ یہ خیال وہ تھا جس نے قوتِ عمل کو کمزور کر دیا۔

تیسری طرف عبادت کے مفہوم کا غلط سمجھ لینا کہ عبادت صرف تنہائی کے مقام پر بیٹھ کر یادِ خدا کر لینا ہے۔ اس لیے عیسائیوں نے رہبانیت کو اختیار کیا کہ پہاڑوں پر غاروں میں تنہائی میں بیٹھ کر خدا کی یاد کیا کریں۔

چوتھی طرف نصاریٰ و یہود میں ایک غلط خیال یہ قائم ہو گیا تھا کہ چونکہ ہم اس کے سچے رسولوں پر ایمان لانے والے ہیں۔ لہٰذا ہم اس کے محبوب ہیں تو بھلا ہم کو وہ سزا کیوں دینے لگا۔ قرآنِ مجید میں ان کے قول کا تذکرہ موجود ہے۔ نحن ابناء اللہ واحباؤہ "ہم خدا کے فرزند اور اس کے دوست ہیں۔" اس کے بعد جو نتیجہ اس سے ان کی ذہنیت کے باعث نکلتا تھا اس کی تشریح کر دی ہے۔ فلم یعذبکم بذنوبکم "تو اب وہ تمھیں تمھارے گناہوں کی سزا کیوں دینے لگا؟"

یہ تمام باتیں وہ تھیں۔ مثلاً، جو دنیا کے معیار کو پست کر رہی تھیں اور عملی حیثیت سے بے حس بنا رہی تھیں۔ لیکن اسلام نے ایک طرف اس ذہنیت کو کہ دنیا میں سبب افتخار، نام و نسب قرار دے لیا گیا تھا۔ یہ کہہ کر باطل کیا کہ لا فخر للعربی علی العجمی ولا للقرشی علیٰ غیر القرشی "کوئی فخر نہیں ہے عرب کو عجم پر نہ قرشی کو غیر قرشی پر۔" اس طرح نسلِ انسان کے افتخار کو باطل کیا گیا۔ بعثت الی الاحمر والاسود "میں سرخ و سیاہ سب کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔" کسی کو کسی پر فخر نہیں ہے۔ قرآنِ مجید نے نسلی امتیاز کو یہ کہہ کر باطل کیا کہ انا خلقنا کم من ذکر وانثیٰ وجعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا "ہم نے تم کو مختلف قبیلوں میں جو الگ الگ کیا ہے تو اس لیے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان لو یعنی ناموں کے اشتراک کی وجہ سے شبہ نہ ہو۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم "لیکن تم میں معزز سب سے زیادہ وہی ہے جو سب سے زیادہ فرض شناس ہو۔" اس طرح نسلی امتیاز کو غلط ثابت کیا۔ ارشاد ہوا کہ انما المومنون اخوۃ

"جو بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں"۔ دنیا نے مختلف قسم کے معیار بنا لیے تھے۔ کچھ لوگوں نے ملکی تفریق قائم کی تھی۔ کچھ لوگوں نے نسلی تفریق قائم کی تھی۔ اسلام نے ایک ہیئتِ اجتماعی اسلام کی تشکیل کی۔ جب سب رشتہ دار ہو گئے تو پھر تفوق ایک کو دوسرے پر کیسا؟ یہ حد تھی ملکی تفریق کو مٹانے کی کہ ملک حبش کے رہنے والے بلال کو جو سیاہ رنگ بھی ضرور تھے۔ یہ امتیاز خصوصی عطا کیا گیا کہ نماز کے لیے اذان دینے والے وہی ہوں۔ ایک طرف شہرت و اعلان سب گمنام اور خاموش، لیکن موذن سر بلندی کے ساتھ اپنی آواز کا سنانے والا۔ دوسری طرف ایک حیثیت سے رہنما، راستہ دکھانے والا۔ لوگ سونے والے وہ جگانے والا، لوگ غافل وہ خبر دینے والا۔ پھر یہ امتیاز کچھ طبیعتوں پر گراں بھی گزر رہا تھا۔ لوگوں کو کھل بھی رہا تھا کہ یہ امتیاز خصوصی رسولؐ کی بارگاہ سے اس شخص کو عطا ہو جائے جو "ش" کو "س" کہتا ہے، لیکن کیا کہنا اس رسولؐ کے طرز عمل کا جس نے تمام معترضین کو یہ کہکر خاموش کر دیا۔ سین بلال شین عند اللہ "بلال کی "س" خدا کے یہاں "ش" ہے۔ روح خلوص بڑھنے کے بعد عمل کی ظاہری بدصورتی کو بھی چھپا دیتی ہے۔ کوئی باکمال آپ کے پاس آئے تو اس کا کمال آپ کو اس کی تعظیم پر مجبور کرے گا۔ چاہے صورت گر بری بھی کیوں نہ ہو۔ جیسے ایک انسان کا ظاہری جسم اور اس میں اس کی روح، اگر روح صاحبِ کمال ہے تو اس ظاہری جسم کی صورت چھپ جائے گی۔ ویسے ہی عمل کی ظاہری شکل اور اس میں روح خالص۔ اگر روح خالص اور درست ہے تو عمل کو بھی اس شخص کے درست کر دے گی۔ بیشک کوتاہی اگر انسان کی اختیاری ہو تو قابلِ الزام ہے اور اگر قدرت کی طرف سے بنایا ہی ایسا گیا تو موردِ الزام بالکل نہیں۔ اس طرح حبش کے رہنے والے کو عزت دی گئی اور ملک فارس کے رہنے والے کو عزت دی گئی اور ملک فارس کے رہنے والے یعنی سلمان۔ کیا کہنا اس عزت کا، قریب کے رہنے والے غیر

ہو گئے مگر وہ دور دراز ملک کا رہنے والا عزیزوں سے بڑھ گیا۔ وہ کیا چیز تھی؟ وہ قوتِ عمل تھی۔ ایک آدمی دس دس گز خندق کھود رہا تھا۔ مگر وہ سلمانؓ تھے جو دس آدمیوں کے برابر کام کر رہے تھے۔ ہر جماعت کی خواہش ہوئی کہ سلمانؓ کو اپنے میں داخل کر لے۔ مگر جب رسولؐ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تو فرمایا کہ "سلمان تم میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ سلمان ہم اہل بیت میں سے ہیں۔"

مال و دولت و استغنائے ظاہری کی بنا پر جو امتیاز قائم کر لیا گیا اس کو اسلام کی جانب سے یہ کہہ کر غلط قرار دیا گیا کہ واللہ الغنی وانتم الفقراء۔ "بس ایک خدا کی ذات ہے جو غنی ہے، اور تم سب فقیر ہو۔"

اب ایک دوسرے پر فخر کرنے کا حق نہیں رہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مال و دولت کا زیادہ ہونا انسان کے لیے استغناء کی دلیل نہیں بلکہ فقر کی دلیل ہے۔ جس قدر دولت زیادہ ہو گی اتنے ہی ضروریات زیادہ ہوں گے۔ اتنی ہی احتیاج زیادہ ہو گی آخر وہ زیادہ غنی ہے جو کم افراد کا محتاج ہو۔ اس معیار پر دیکھا جائے تو غنیٔ مطلق تو کوئی فرد عالمِ امکان میں مل ہی نہیں سکتا۔ بس! مدارجِ احتیاج مختلف ہیں۔ ایک مفلس بے نوا جو اپنے ہاتھ سے زراعت کرتا ہے بہت غنی ہے اس بادشاہ کی نسبت جو اپنی زندگی اس وقت تک نہیں گذار سکتا جب تک ہزاروں آدمی اس کے انتظام ملک اور انتظام خانہ داری کے اسباب مہیا نہ کریں۔ جتنا جتنا دنیا میں تفوق بڑھتا جائے گا اتنی ہی احتیاج زیادہ ہوتی جائے گی۔ مال و دولت کو "حطام" کے لفظ سے تعبیر کیا، مال و دولت کو یہ کہا کہ ہاتھ کا میل ہے۔ پھر ایک انسان اگر اپنے جسم پر زیادہ میل ہونے سے فخر کر سکے تو اس مال و دولت پر فخر کرنا بھی زیب ہے۔ اس طرح مال و دولت کے امتیاز کو مٹایا۔ بے شک مال و دولت کو اگر کوئی شخص ذریعہ قرار دے

امورِ خیر کے انصرام کا۔ تو یقیناً یہ مال و دولت سببِ نجاتِ اخروی بن سکتا ہے۔ لیکن اس وقت مال و دولت سببِ امتیاز نہیں ہے۔ بلکہ وہ عمل سببِ امتیاز ہے۔ مال و دولت ذمہ داریوں کو بڑھاتا ہے۔ انسان کو زیادہ پابند بناتا ہے۔ انسان کو زیادہ خطرہ میں ڈالتا ہے۔ بہت سے معاصی ہیں جو انسان سے محض دولت مندی کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر وہ سبک بار ہوتا تو شاید وہ ان معاصی میں مبتلا نہ ہوتا۔ اس کے بعد حکومت وسلطنت، وہ تو مال و دولت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ کتنے سر تھے جو صبح کو تاجِ شاہی رکھتے تھے اور شام کو ٹھوکریں کھاتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ وہ آدمی کل تک چترِ شاہی جن کے سروں پر تھے۔ دوسرے دن قبر بھی نصیب نہ ہوئی اس پر فخر کیسا؟ نام ونسب۔ اس امتیاز کو قدرت نے غلط ثابت کیا۔ نوحؑ کا قصہ پیش کر کے طوفان کے اٹھتے ہوئے موجے اور اس میں ایک کشتی اس پر حضرت نوحؑ اور ان کے تمام اہل بیتؑ ان کا بیٹا پانی میں غرق ہو رہا تھا، نوحؑ آواز دیتے ہیں "میرے ساتھ کشتی میں سوار ہو جاؤ۔" یا بنی ارکب معنا ولا تکن مع الکافرین۔ بیٹے نے توجہ نہیں کی۔ موجوں نے ڈھانپ لینا چاہا۔ نوحؑ متوجہ ہو گئے، خدا کی طرف اس کے ایک وعدہ کا واسطہ دینے لگے۔ ان ابنی من اھلی وان وعدک الحق۔ "میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے۔" وعدہ یہ ہوا تھا کہ تمھارے اہل غرق سے محفوظ رہیں گے۔ قدرت کی طرف سے جواب مل گیا۔ انہ لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح "یہ تمھارے اہل میں سے نہیں ہے یہ تو عمل غیر صالح ہے۔" اس طرح فرزندی کے رشتہ کو جو کسی نبی کی طرف انتساب رکھتا ہو بے اعتبار ثابت کیا۔

یہ عمل وہ چیز ہے جو مجتمع اجزا کو منتشر کرتا ہے اور منتشر عناصر کو باہم بناتا ہے۔ یہ اسلام کی تعلیم ہے اور اس طرح اس نے عملی طاقت کو نوعِ انسانی کے بلند کیا۔ کہ دنیا کسی

چیز کو سبب امتیاز نہ سمجھے۔ جو کچھ سببِ امتیاز قرار دیا جائے وہ عملِ صالح ہے۔

ملاحظہ فرمایئے۔

قرآن مجید میں خطاب ہے رسالتمآب سے، دوسروں کو تعلیم دینا مدِ نظر ہوتا ہے تو کسی خاص شخص سے خطاب کر کے کہا جاتا ہے، اسلام کے نقطۂ نظر سے رسولؐ کی شخصیت سے بڑھ کر اور کسی کی شخصیت دنیا میں نہیں ہو سکتی۔ مگر شخصی خصوصیت کو معیارِ عمل کے سامنے بے اعتبار ثابت کرنے کے لیے ارشاد ہوا۔ لئن اشرکت لیحبطن عملک ولتکونن من الخاسرین۔ اللہ اکبر۔ خدائے ملک و ملکوت کا جاہ و جلال ہے کہ رسولؐ کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے یقیناً رسولؐ کو اس کی ضرورت نہ تھی مگر ہم کو سنانے کی ضرورت تھی۔ کہا جا رہا ہے "اگر تم شرک کرو تو تمھارے اعمال حبط ہو جائیں۔ اور تم روزِ قیامت نقصان اٹھانے والوں میں محسوب ہو۔

ایک جگہ ارشاد ہوا۔ لو اتبعت اھواءھم من بعد ما جاءک من العلم انک اذا لمن الظالمین۔ "اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگو باوجود اس علم کے جو تم کو حاصل ہو گیا ہے تو کیا ہوگا؟ تمھارا شمار ظالمین میں ہو جائے گا۔

ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

ولوا اتبعت اھواءھم بعد ما جاءک من العلم مالک من اللہ من ولی ولا نصیر۔

"اگر تم ان کی پیروی کرو اس کے بعد کہ تمھارے پاس علم آ چکا، تو یاد رکھو۔ پھر ہم تمھارے ساتھ نہیں ہیں۔"

اس طرح یہ ظاہر کیا کہ رسولؐ کی بھی شخصیت کے ہم جانبدار نہیں ہیں۔ ہم کو

۳/ ...

۲/۱۴۵

۲/۱۲۰

تو رسولؐ کا عمل محبوب ہے۔ رسولؐ کے ذاتی کمالات محبوب ہیں۔ رسولؐ کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بے شک رسولؐ کی طرف ان باتوں کی نسبت دینا دیسا ہی تھا جیسے یہ کہا کہ لو کان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا۔" اگر زمین میں دو خدا ہوتے تو فساد ہوتا۔" یہ سب فرض محال کے طور پر کہا گیا ہے۔ لیکن نتیجہ یہ ضرور نکلتا ہے کہ درحقیقت عمل ہی وہ چیز ہے جو معیار بلندی اور معیار محبت الٰہی ہے۔ اسی طور پر رسولؐ نے اپنے عزیز داروں کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا یا بنی عبد المطلب انی لا اغنی عنکم من اللہ شیئا۔ سنو، اے میرے خاص رشتہ دارو اور عزیزو! میں خدا کے مقابلہ میں تمہاری کوئی جانبداری نہیں کرسکتا۔ خدا کی اطاعت تمہارے لیے بہر حال ضروری ہے۔ ایک مقام پر جہاں ازواجِ رسولؐ کو مخاطب کیا گیا ہے وہاں یہ کہا ہے کہ رسولؐ کی طرف انتساب کی وجہ سے تمہاری ذمہ داری زیادہ ہے۔ لستن کاحد من النساء، تم اور عورتوں کے مثل نہیں ہو اور عورتیں اگر کسی حکم کے خلاف کریں تب بھی وہ اتنا قابل گرفت نہیں ہے جتنا تمہارا مخالفت کرنا، تم کو امتیاز خصوصی حاصل ہے لہٰذا تم کو ان احکام کا بیشتر پابند ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد یہ ارشاد ہے:۔

من یات منکن بفاحشۃ مبینۃ یضاعف لھا العذاب ضعفین۔ "اگر تم میں سے کسی نے کوئی گناہ کیا تو میں اس کی سزا کو دونا کردونگا۔"

اس طرح انتساب کی دشواری کو بتلایا۔ امیر المومنینؑ نے ایک خط میں جو ابن عباس کو تحریر فرمایا ہے یا کسی اور عزیز کو جو آپ کی طرف سے گورنر تھے بصرہ کے۔ مگر آپ کو خبر پہنچی کہ انھوں نے خزانہ بیت المال کے اموال کو منتقل کردیا اپنے گھر کی طرف۔

تحریر فرمایا ہے۔ واللہ لو ان الحسن والحسین فعلا مثل الذی فعلت ما کان لھما عندی ھوادۃ ولا ظفرا منی بارادۃ حتی اخذ الحق منھما

"خدا کی قسم اگر حسنؑ و حسینؑ سے یہ طرز عمل صادر ہوتا۔ جو تم سے ہوا تو یاد رکھو کہ میں ان کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہ کرتا اور ان سے حق کو حاصل کر کے رہتا۔"

اس طرح ہر قسم کے انتساب کو عمل کے مقابلہ میں بے کار ثابت کیا گیا ہے۔ عمل قابل فخر ہے۔ بے شک اگر اس کے ساتھ انتساب بھی ہو تو وہ انتسابِ عمل کے ساتھ مل کر ایک شرف کا باعث ہے۔ لیکن یہ قاعدہ ہے کہ ہر چیز جس میں شرف زیادہ ہو اس کی ذمہ داری بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ یعنی جاہل سے بڑھ کر عالم کی ذمہ داری ہے۔ عالم سے زیادہ انبیاء کی ذمہ داری ہے۔ انبیاء میں جتنا درجہ زیادہ قرب کا بڑھتا جائے اتنی ہی ذمہ داریاں بھی بڑھتی جائیں گی۔

وہ چیزیں جو عام افراد کے لیے قابل اعتراض نہیں ہیں وہ علماء سے قابلِ اعتراض ہیں وہ چیزیں جو ان سے قابلِ اعتراض ہیں شرف کے بڑھنے سے ذمہ داری بڑھتی ہے اور اگر اس ذمہ داری کے پورا کرنے کے ساتھ شرف بھی ہو تو کیا کہنا! لیکن اگر شرف کے ساتھ ذمہ داری مفقود ہو گئی تو پھر وہ شرف انسان کے لیے عار و ننگ ہوگا۔ اسی صورت سے انتساب کسی ایسی ہستی کی طرف جو صاحب شرف ہے قابلِ فخر ہے لیکن اسی وقت جبکہ عار و ننگ کا دھبہ دامن پر نہ آیا ہو۔

وہ چیزیں جن کو اسلام نے طرۂ امتیاز قرار دیا ہے۔ جیسے علم، عمل، نبوت، امامت رسالت، ان چیزوں کو بجائے خود قدرت نے سربلندی عطا کی ہے۔ بے شک ان کی طرف انتساب قابلِ شرف ہوگا۔ لیکن ذمہ داری کے ساتھ ساتھ یعنی سید اپنی سیادت پر گھمنڈ نہ کریں کہ ہم سید ہیں بلکہ اس کے ساتھ عمل کی ذمہ داری کا زیادہ احساس کریں۔ اگر کسی غیر سید سے لغزش ہو تو وہ اتنا قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ جس

قدر سیدؑ سے لغزش ہوتا۔ یہ ایک طرف تو معصیت الٰہی ہے دوسری طرف اس رشتہ کی توہین ہے جو رسولؐ کے ساتھ انتساب رکھنے والا اگر معصیت کا مرتکب ہو تو اس سے معصیت کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ جس طرح ایک گناہ کو آپ اپنے گھر میں کیجیے اور اسی کو مسجد میں کیجیے تو اس کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ اسی طرح سے یہ معصیت جو ایک رسولؐ کے منتسب کی طرف سے ہو ایک طرف گناہ ہے اور دوسری طرف رسولؐ کی توہین ہے۔
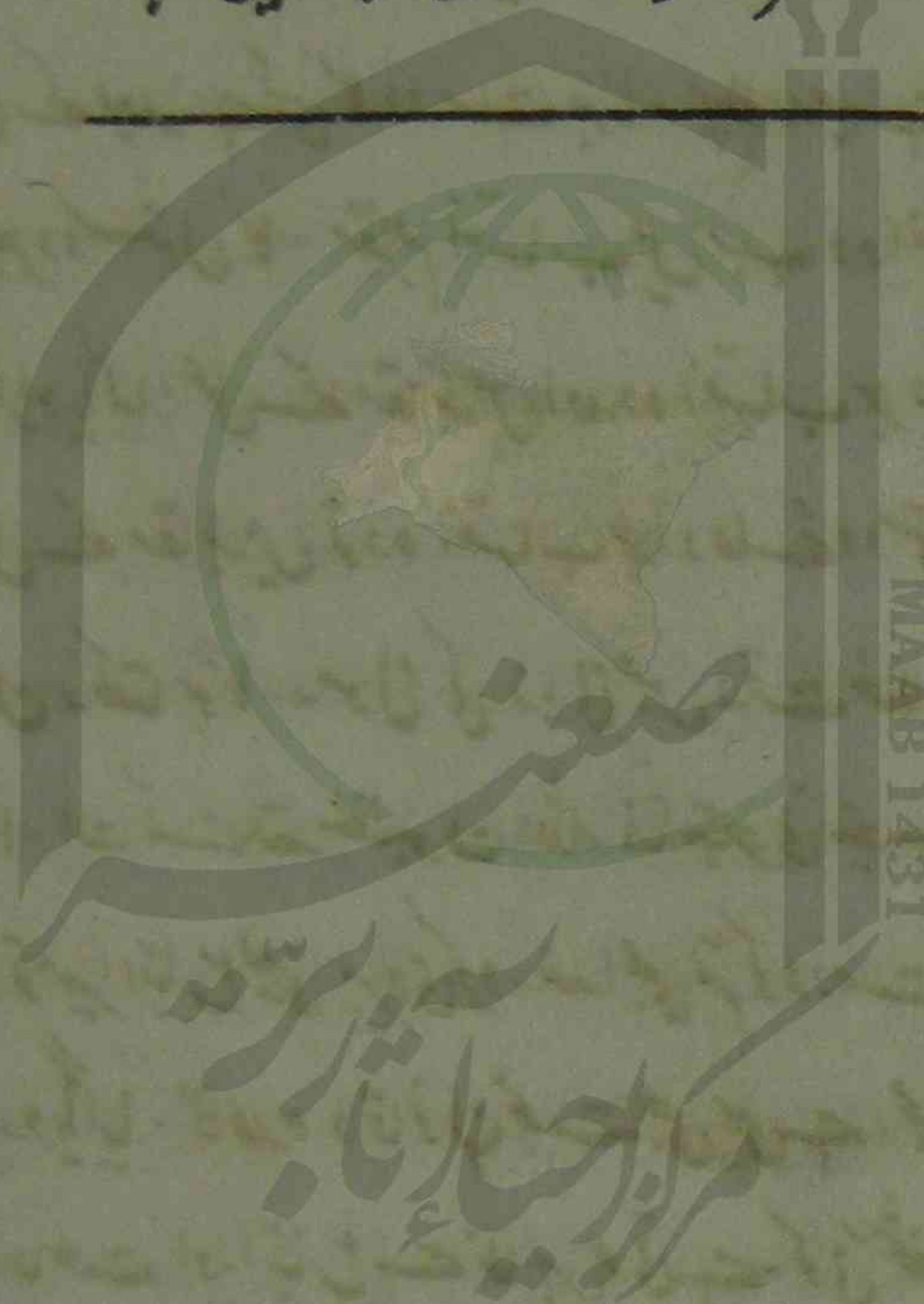
عمل اور محبت

کسی قسم کا انتساب عمل کے مقابلہ میں قابلِ فخر نہیں سمجھا جائے گا۔ یہ انتساب وہ ہیں جو ظاہری حیثیت سے انتہائی قوت رکھتے ہیں۔ یعنی کسی کی اولاد ہونا۔ اس کے بعد کسی کا عزیز دار ہونا، اس کے بعد ہے کسی کا دوست ہونا۔ پہلا درجہ ہے اولاد کا۔ اس کے بعد عزیزوں کا۔ پھر دوستوں کا۔ مقامِ انتساب میں جب وہ انتساب جو فرزندی کا تھا نظرِ اعتبار سے گرا دیا گیا، عمل کے مقابلہ میں اور وہ انتساب جو عزیز داری کا تھا، وہ بے اعتبار ہو گیا عمل کے مقابلہ میں تو وہ انتساب جو ادعائے دوستی کی بنا پر ہو وہ عمل کے مقابلہ میں کیا وزن رکھتا ہو گا۔ رسولؐ کی زبانی جس وقت خطاب ہوا اور معیارِ محبت بتلایا گیا تو ارشاد ہوا۔ ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ اگر خدا کو دوست رکھتے ہو تو میرا اتباع یعنی پیروی کرو۔ خدا بھی تم کو دوست رکھے گا۔ محبت کا معیار اتباع کو قرار دیا گیا۔ قاعدہ و قانونِ محبت بھی یہی ہے۔ محبت کے سچے اور جھوٹے ہونے کی تفریق اطاعت اور اتباع سے ظاہر ہوتی ہے۔ کوئی شخص آپ کی دوستی کا دم بھرنے والا ہے تو آپ اس کی محبت کو کس طرح جانچتے ہیں۔ اس طرح کہ کوئی فرمائش کر دیں۔ اگر عمل پیرا ہو تو معلوم ہو گا کہ آپ کا دوست ہے۔ اور کوئی عذر کرے تو سمجھ لیجیے گا کہ یہ محبت نہیں ہے۔ اب جتنا اسے محبت کا دعویٰ ہو اتنا ہی اسے سخت حکم دیا جائے گا۔ جتنی زیادہ خصوصیت کا آپ سے دعوے دار ہے اتنا ہی زیادہ سخت فرائض سپرد کیے جائیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ محبت کا دعویٰ اتباع کے ساتھ ہی سندِ قبول حاصل کرتا ہے۔ معیار یہی قرار دیا گیا ہے کہ جس کی محبت ہے اس کے کہنے پر چلنا لازمی ہے۔

انبیاء و مرسلین براہِ راست خدا کی محبت رکھتے تھے۔ خدا کی طرف سے اس محبت کو معیارِ امتحان پر جانچا گیا۔ خود سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ دنیا کے سامنے ظاہر کرنے کے لیے۔ اس نے عمل سے امتحان لیا۔ جناب ابراہیمؑ کو حکم دے دیا گیا۔ ذبح اسمٰعیلؑ کا یہ محبت کو عمل کے اعتبار پر کسنا تھا اس کے بعد عمل بمعیارِ امتحان پر کامل ثابت ہوا تو بے شک پھر محبت کی سند بھی مل گئی۔ خلیلؑ کا لقب بھی مل گیا۔ عالمِ کائنات کی معزز ترین ہستی یعنی رسالتمآبؐ سے بڑھ کر تقربِ الٰہی کسی کو حاصل نہیں ہے تو جتنے فرائض ہمارے ہیں ان سے زیادہ ان پر عائد کیے گئے تھے۔ نمازِ شب اگر ہم ترک کر دیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن ان کیلئے نمازِ شب واجب تھی جتنے احکام فرض تھے دوسروں پر ان پر سب سے بڑھکر عمل کیا۔ اسکے علاوہ بھی کچھ احکام انکے ذمہ واجب الادا تھے جو ہمارے لیے نہیں ہیں تو درحقیقت محبت معیارِ حقانیت پر اسوقت کامل اترتی ہے جب اتباع کا ثبوت دے رہا ہو ورنہ وہ دعویٔ محبت جسکے ساتھ اتباع نہ ہو انسان کیلئے ان لوگوں کی خوشنودی اور رضا کا باعث نہ ہوگا جنکے ساتھ دعویٔ محبت ہو رہا ہو اہلبیتؑ رسولؐ کی محبت جو مسلمانوں پر فرض ہوئی وہ صرف اسلیے کہ انکے طریقِ عمل پر چلنا آسان ہو جائے فطرت کا تقاضا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ محبت ہوگی تو وہ اس کے ساتھ چلے گا۔ چنانچہ محبت کے دعوے کو ائمہ معصومینؑ نے بھی اطاعت ہی کے معیار پر جانچا۔ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں سہل خراسانی حاضر ہوئے۔ انھوں نے کہا آپ اپنے حقوق کے طلب کرنے کے لیے تلوار کیوں نہیں اٹھاتے۔ حضرت نے فرمایا۔ "اعوان و انصار کہاں ہیں" سہل نے کہا "حضور کے قدموں پر جان نثار کرنے والے دنیا میں بہت ہیں۔ اس وقت ایران میں ہزاروں تلواریں ہیں جو آپ کے اشارہ پر کھنچ سکتی ہیں۔ وہ سب آپ کے دوست ہیں۔"

یہ سن کر حضرت نے ذرا دیر خاموشی اختیار فرمائی پھر خادم کو بلا کر حکم دیا کہ تنور میں آگ روشن کر دو۔ آگ روشن ہو گئی۔ آپ سہل کی طرف متوجہ ہوئے۔ فرمایا "سہل اس تنور میں داخل ہو جاؤ۔" ان کے جسم میں لرزہ پڑ گیا۔ معافی طلب کی۔ حضرت نے سکوت کیا۔ تھوڑی

دیر میں ہارون مکی داخل ہوئے۔ ابھی نعلین ہاتھ ہی میں تھی۔ جوابِ سلام کے بعد سب سے پہلے حضرت نے ان سے یہی فرمایا کہ "اے ہارون مکی! اس تنور میں داخل تو ہو جاؤ۔" انھوں نے یہ بھی نہیں دریافت کیا کہ کیا واقعہ ہے۔ فوراً تنور کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محبت کی کسوٹی ہے حکم کا اتباع۔ امام جعفر صادق (علیہ السلام) فرماتے ہیں اپنے اصحاب کو مخاطب کر کے۔ من اطاع اللہ فھولنا محب و من عص اللہ فھولنا عدو۔ "جو شخص خدا کی اطاعت کرے وہ ہمارا دوست ہے اور جو خدا کی معصیت کرے وہ ہمارا دشمن ہے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اگر انتساب کے ساتھ معصیت ہو تو معصیت کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف تو وہ معصیت ہے اور دوسری طرف اس نسبت کی توہین ہے۔ اسی لیے امامؑ نے فرمایا ہے کونوا لنا زینا ولا تکونوا علینا شینا۔ "تم ہمارا شیعہ اپنے کو کہتے ہو تو اپنے طرزِ عمل سے ہمارے لیے سببِ نازش بنو۔ ہمارے لیے سببِ عار و ننگ نہ بنو۔" اگر ہم اپنے کو ان حضرات کی طرف منسوب کریں اور عمل میں کوئی پابندی نہ کریں تو ہم نے اس انتساب کی توہین کی ہے اور اس سے توہین ہوتی ہے، ان افراد کی جن کی طرف وہ انتساب ہو رہا ہے۔ پھر جس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے انہی فرائض کے قائم کرنے کے لیے اپنی جانیں دے دیں انھوں نے اسی پابندیٔ شریعت کے رواج دینے کے لیے اپنے کو ظاہری حیثیت سے مٹا دیا۔ نماز کی اہمیت اس حد پر کہ امیر المومنینؑ کا مصلیٰ جنگ صفین میں دونوں لشکروں کے درمیان بچھا دیا جاتا ہے۔ ابن عباسؓ عرض کرتے ہیں کہ ہم تو جنگ کرتے ہیں، یہ نماز کا موقع ہے؟ فرماتے ہیں: "اسی نماز کے لیے تو جنگ ہو رہی ہے۔" امام زین العابدین علیہ السلام کے احتضار کا عالم ہے۔ وفات کے پہلے تمام اعزا اور احباب کو جمع کیا۔ آخری بات جو زبان سے نکلی وہ تین مرتبہ "الصلوٰۃ، الصلوٰۃ، الصلوٰۃ" اس کے بعد زبان بند ہو جاتی ہے اب محبت

کا تقاضا کیا ہوتا ہے؟ کوئی مرنے والا مرتا ہے تو اعزا اور احباب کو فکر ہوتی ہے کہ آخری وصیت کیا کی ہے؟ اس کو حتی الامکان ضرور پورا کرتے ہیں۔

ہم محبت کا دعویٰ کر رہے ہیں اور ان چیزوں کو جنھیں قائم کرنے کے لیے ہماری محبوب ہستیوں نے اپنی جانیں دیں گھر بار لٹا یا۔ مرتے مرتے وصیتیں کیں ان چیزوں کو ہم اپنے اعمال سے پامال کریں۔ بلکہ ہم ان کی محبت ہی کو بہانہ قرار دیں۔ ان احکام کے مٹانے کا۔ یہ تو درحقیقت دوستی نہ ہوگی۔ ہم سنا کرتے ہیں واقعاتِ کربلا۔ ان سے سبق کیوں نہیں لیتے، کیا وہ بے قدر چیز تھی جس کے لیے آخری ایک شب کی مہلت لی گئی۔ پھر روزِ عاشور جب بازارِ موت گرم تھا۔ اس وقت یہ کہا کہ ہم کو نماز کی مہلت دے دو۔ حالانکہ معلوم بھی تھا کہ اس پر جواب کتنا سخت ملے گا۔ یہ کیا تھا؟ عبادت خدا کی اہمیت تھی جس کا ایسے ایسے اوقات میں خیال رکھا۔ انھی چیزوں کو ہم چھوڑ دیں اور محبت کا دعویٰ بھی کریں۔ یہ ہمارے لیے سببِ نازش نہیں ہے بلکہ سببِ وبال ہوگا آپ نے سنا ہوگا کہ آپ کے نامۂ اعمال حضرت حجت کے سامنے پیش ہوا کرتے ہیں حضرت اس پر نظر فرماتے ہیں، اگر اچھے عمل نظر آئے تو چہرہ پر بالیدگی ظاہر ہوتی ہے اگر برے عمل پیش ہوتے ہیں تو آنسو نکل آتے ہیں۔ ہم اپنے امام کے گریہ و بکا کے باعث ہوں اور پھر دوست سمجھے جائیں۔ درحقیقت اسلام کے تمام تعلیمات قوتِ عمل کو ترقی دینے والے ہیں۔ اسلام نے محبت کا حکم دیا۔ تو وہ عمل کی اصلاح کے لیے تھا۔ اس لیے کہ ایسے افراد جو سرتاپا مجموعۂ کمالات ہیں جو سر سے پاؤں تک نمونہ ہیں تعلیماتِ اسلام کے، فطری قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی کو دوست رکھتا ہے وہ اس کے لباس کو بھی دوست رکھتا ہے۔ اس کے افعال کو بھی دوست رکھتا ہے۔ الناس علیٰ دین ملوکھم۔ سلطنت کے اقتدار کی وجہ سے بادشاہ کا اثر دل پر بیٹھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہنیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ وہ اثر ہے

جو جبری سلطنت کے شکوہ سے دل پر پڑتا ہے لیکن اگر کسی کا حقیقی اثر دل پہ قائم ہو جائے تو ناممکن ہے کہ انسان اس کے اخلاق و عادات سے نفرت کرے اور بیزار ہو درحقیقت ظاہر باطن کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ تمام اعضاء و جوارح تابع دل ہیں۔ اگر دل کسی طرف مائل ہو گیا تو پھر ناممکن ہے کہ اعضاء و جوارح سرتابی کر جائیں۔ یہ وہ سلطنت نہیں ہے جس میں کبھی بغاوت ہوتی ہو۔ سب دل کے مطیع ہیں۔ یہ کبھی مخالفت نہیں کرتے۔ اگر دل پر کسی کا سکہ قائم ہو جائے تو اعضاء و جوارح بھی متاثر ہوں گے۔

من تشبہ بقوم فھو منھم۔ "جو شخص کسی قوم سے شباہت اختیار کرے انہی کے ساتھ محسوب ہوگا۔ اس کا فلسفہ کیا ہے؟ یہی کہ یہ شباہت دلیل ہے اس بات کی کہ اس کا میلان اسی طرف ہے۔ یہ اسلام کی تاکید کہ اہل بیتؑ کے ساتھ محبت کرو، اسی لیے تھی کہ محبت کے ذریعہ سے دل پر سکہ قائم ہو جائے۔ پھر تمام اعضاء و جوارح خود ہی دل کے راستے پر چلیں گے۔ یہ محبت کا حکم تمہید عمل تھا جس طرح معرفتِ باری تعالیٰ بھی اصلاح ہی کے لیے ہے۔ مگر ہم اس عہد سے بعید ہو گئے ہیں۔ جب ہدایات کی بارش ہو رہی تھی دور ہوتے ہوتے ہمارے ذہنیتوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ دنیا سہولت کو پسند کرتی ہے جس میں زیادہ ظاہری آسانی ہوئی وہی طبائع کے اندر راسخ ہو گیا۔ جس طرح نصاریٰ نے قوتِ عمل کو سلب کیا یہ کہہ کر کہ مسیح جو دنیا سے اٹھے تو سب گناہوں کی ذمہ داری لیتے گئے۔ ان کے سولی پہ چڑھ جانے نے ہم کو آزاد کر دیا۔ اب ہم پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ اسلام نے اس کو یہ کہہ کر باطل کیا کہ لا تزر وازرۃ وزر اخری "کوئی ایک دوسرے کے گناہ کا ذمہ دار نہیں ہے۔" اسی طرح یہ افسوسناک امر ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال قائم ہو گیا ہے کہ حضرت سید الشہداءؑ اسی معنی

میں نجات دہندہ ہیں جن معنوں میں عیسائی مسیح کو نجات دہندہ خیال کرتے تھے۔ یہ جو ذاکروں کی زبانی سن لیا ہے کہ حضرت نے گناہگاروں کے لیے شہادت اختیار کی تو یہ سمجھنے لگے کہ اب ہم جو چاہیں کریں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ معاذ اللہ ہم نے امام حسین علیہ السلام کی شہادت کو گناہ کی ترقی کا ذریعہ قرار دے لیا ہے جس چیز کے قائم کرنے کے لیے انھوں نے جان دی تھی ہم اپنی غلط ذہنیت کے ذریعہ سے ان کی شہادت کو اس کے پامال کرنے کا باعث قرار دے رہے ہیں۔ ہم نے امام حسین علیہ السلام کو اپنے معاصی کے حق بجانب ثابت کرنے کا بہانہ قرار دیا ہے ہم نے کبھی کوشش نہیں کی اس بات کو سمجھنے کی کہ حسینؑ کس طرح نجات دہندۂ امت ہیں۔ انھوں نے بے شک ہماری نجات کے سامان مہیا کرنے کے لیے اپنی جان دی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام سے اسلام کی حقیقی صورت رخصت ہو چکی تھی۔ دنیا میں معصیت کی تاریکی تھی۔ اطاعتِ الٰہی ایک فراموش شدہ چیز بن چکی تھی۔ دنیا بادشاہوں کے راستوں پر چل رہی تھی۔ بلکہ ان کو نائب رسولؐ سمجھ رہی تھی۔ مذہبی تخت پر بیٹھنے والا ہر قسم کے فسق و فجور کا مرتکب ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ رشتہ داروں یعنی ماؤں اور بہنوں کو بھی نہ چھوڑتا تھا۔ غسیل الملائکہ کی زبانی ہے کہ ہم نے اس وقت خروج کیا جب ہم کو خوف ہو گیا کہ آسمان سے ہم پر پتھر برسیں گے۔ انہ کان رجلا ینکح الاخوات و امہات الاولاد "جس وقت دنیا کی ذہنیت تبدیل ہو گئی اور اسلام کے خط و خال مٹ چکے تھے جس وقت ذمہ دار اشخاص اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے۔ اور کوئی اعتراض کی جراَت نہیں کرتا تھا۔ اس وقت اگر رسولؐ کا فرزند اگر اسلام کا ایک ذمہ دار رہنما یعنی حسینؑ ابن علیؑ۔ یزید کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا تو دنیا میں پھر اسلام کی تصویر نہ دکھائی دیتی۔ دنیا میں پھر احکام اسلام کے نام لیوا دکھائی نہ دیتے، اس کے معنی یہ ہیں کہ

امتِ مرحومہ جو رسولؐ کے قول کے مطابق نجات کی مستحق تھی وہ جا رہی تھی ہلاکت ابدی کے راستے پر لیکن حسینؑ نے اپنی جان دے کر حقانیت کو ظاہر کیا اور دنیا کو بتایا کہ سلطنت اور ہے اور طاعت باری اور ہے، دنیا کچھ اور ہے، دین کچھ اور ہے حق اور ہے باطل اور ہے، دنیا کی آنکھیں کھول دیں، دنیا کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے۔ اس طرح اسلام حسینؑ کی بدولت قائم رہا حسین ہماری نجات کے باعث ہوئے امتِ رسولؐ کی نجات کے باعث ہوئے۔ لیکن اس کے کیا معنی؟ اس کے یہ معنی ہیں کہ حسینؑ نے نجات کا راستہ نمایاں کر دیا۔ نجات کا ذریعہ بتا دیا نجات کی صورت نمایاں کر دی۔ اس طرح حسینؑ نجات دہندۂ امت ہیں یعنی حسینؑ نے ایک امت کی تشکیل کی جو اپنے عمل سے نجات کی مستحق ثابت ہو اور اس لیے درحقیقت ہم حسینؑ کے وجود کو نشاۃ ثانیۂ اسلام کا باعث سمجھتے ہیں۔ یعنی اگر رسولؐ نے اسلام کو قائم کیا تو حسینؑ نے اسلام کو دوسرا وجود دیا۔ حسینؑ نجات دہندہ ہیں یعنی اگر حسینؑ نہ ہوتے اور ان کا طرزِ عمل نہ ہوتا تو ہم نجات کے مستحق نہ ہوتے۔ یعنی ہم وہ عمل ہی نہ کرتے جو سببِ نجات قرار پا سکیں۔ ہم اس راستے ہی پر نہ چلتے جو نجات کا باعث ہو سکتا ہے۔ حسینؑ نے اپنے طرزِ عمل سے ہم کو نجات کا مستحق بنا دیا ہمیں ایسے طریقوں پر کاربند بنا دیا کہ ہم اپنے عمل سے نجات کے مستحق ہوئے۔ اس طرح سے حسین نجات دہندہ ہیں۔ اس طرح نہیں جس طرح عیسائیوں کے مسیح نے گناہوں کا راستہ کھول دیا۔ ہمارا مظلوم شہید تو اطاعت کے راستے پر لے جانے والا تھا۔ گناہوں کا دروازہ کھولنے والا نہیں تھا۔ حسینؑ نے ہمارے قوائے عملی کو معطل نہیں کیا۔ درحقیقت گریہ و بکا کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بہتر سے بہتر ثواب مقرر کیے گئے ہیں۔ اس لیے کہ اگر گریہ و بکا کا ثواب ہمارے سامنے ہوگا تو ہم ان کے حالات کو زیادہ پیش نظر رکھنے پر آمادہ ہوں گے۔ اور اس کا ہمارے اعمال پر اثر

پڑے گا۔ ورنہ یاد رکھیے اگر اتنی اہمیت اس واقعہ کو بحیثیت مصیبت نہ دی گئی ہوتی تو دنیا کے تمام واقعات کی طرح یہ بھی تاریخی کتابوں کے سپرد ہو جاتا۔ اور یہ جو ہمارا بچہ بچہ اس واقعہ سے واقف ہے یہ کبھی نہ ہوتا۔ آج ہم اس سے واقف ہی نہ ہوتے تو سبق کیا حاصل کرتے؟ لیکن یہ دعوت مصیبت سے اثر لینے کی طرف! گریہ کی طرف یہ تو مقتضائے فطرت ہے۔ اس کو خاص طور سے قائم کرنے کی دعوت اس لیے تھی کہ واقعات بھولنے نہ پائیں۔ تاکہ اس واقعہ کے اصلی مفاد جو ہیں وہ محفوظ رہیں اس واقعہ کا اصلی مقصد جو ہے وہ قائم رہے۔ اور عملی ترقی زیادہ سے زیادہ پیدا ہوتی رہے۔ واقعہ کربلا کے چھوٹے چھوٹے جزئیات تک دین تعلیم اسلام کا نمونہ ہے۔ بلکہ ہر عمل میں کوئی ایک پہلو ہوتا ہے تعلیم کا۔ واقعہ کربلا باوجود اپنی مختصر مدت کے تمام اہم تعلیمات اسلام کا مرکز تھا۔ ہر قسم کی عملی تعلیم، حق اللہ سے متعلق حق الناس سے متعلق، تربیت منزل سے متعلق، معیار ملک وسلطنت سے متعلق۔ تمدن سے متعلق اجتماعی وانفرادی زندگی سے متعلق، شرائط محبت سے متعلق تمام اخلاقی، علمی اور عملی تعلیمات سب کے سب واقعہ کربلا میں مضمر ہیں۔ اس لیے اس واقعہ کے چھوٹے چھوٹے جزئیات بھی وہ اہمیت رکھتے تھے جن کو ہم تک پہنچانا ضروری تھا۔ یاد رہے کہ ہم امام حسینؑ کو صرف اس بناء پر دوست نہیں رکھتے تھے اور مستحق تعظیم نہیں سمجھتے کہ وہ رسولؐ کے نواسے تھے۔ رسالتمآبؐ نے بھی کبھی ان افراد کو صرف اس وجہ سے دوست نہیں رکھا کہ وہ آپ سے نسبت اور رشتہ داری رکھتے تھے۔ یہ کہنا درحقیقت رسولؐ کی روحانی شخصیت پر الزام لگانا ہے۔ ہم امیر المومنینؑ کو اس لیے دوست نہیں رکھتے کہ وہ داماد تھے یا چچازاد بھائی تھے۔ ہم حضرت سیدہ عالمؑ سے صرف اس لیے عقیدت نہیں رکھتے کہ وہ حضرت کی صاحبزادی تھیں۔ خود رسولؐ نے بھی جو کچھ ان حضرات کا پاس کیا وہ اس لیے تھا کہ آپ کے اخلاق اور آپ کے

کمالات کی یہ افراد سچی تصویر تھے۔ ہم ان افراد کے لیے شرطِ عقیدت اس لیے ادا کرتے ہیں کہ وہ عملی حیثیت سے ہمارے مقتدا ہونے کے قابل تھے۔ ہم نے کبھی شرائط امامت میں رشتہ داری کو نہیں رکھا ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ وہ افراد جو معصوم تھے وہ حضرت کی اولاد میں سے تھے یا حضرت کے داماد تھے۔ لیکن ہم نے شرائط امامت میں یہ نہیں قرار دیا ہے کہ حضرت کا داماد ہو یا اولاد میں سے ہو

جتنی اہمیت واقعۂ کربلا کو دی گئی تھی اس لیے نہ تھی کہ رسولؐ کی طرف انتساب رکھنے والی ہستیاں تھیں۔ بلکہ درحقیقت اس لیے کہ اسلام کے سچے مجسمے جن کو مسلمانوں کی تلواروں نے تہ تیغ کیا واقعۂ کربلا کی زیادہ سے زیادہ تبلیغ بھی اس غرض سے نہیں ہوئی کہ وہ ایک دردانگیز مصیبت ہے جسے یاد رکھنا چاہیئے۔ بلکہ اس لیے کہ جس مقصد سے یہ مصائب برداشت کیے گئے اس سے ہم روشناس ہوسکیں۔

بے شک حسینؑ پر رونا مستقل عبادت ہے اور رضائے الٰہی کا سبب ہے مگر اسلام کا مقصد اس سے ہماری عملی اصلاح ہی تھی۔ اب اگر ہم نے اس مقصد کو بھلا دیا اور اپنے پیش نظر نہیں رکھا ہے تو اس میں اسلام کا قصور نہیں ہے۔

اسلام میں عمل کی اہمیت

حقیقت امر یہ ہے کہ اسلام سے بڑھ کر کوئی مذہب نہیں ہے جس نے عمل کو معیار قرار دیا ہو۔ قرآن مجید میں جہاں نجات کا ذکر کیا گیا ہے وہاں عمل صالح کو شرط قرار دیا ہے۔ ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات طوبیٰ لھم وحسن مآب۔ "وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے ہیں ان کے لیے بہترین بازگشت ہے" ذلک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ ومما رزقنھم ینفقون۔ "اس کتاب "قرآن" میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ یہ ہدایت ہے اس جماعت کے لیے جو خدا سے ڈرنے والی ہے، جو غیب پر ایمان لاتی ہے اور نماز پڑھتی ہے اور زکوٰۃ ادا کرتی ہے"۔

اس میں جہاں ایمان کی طرف اشارہ ہے وہاں اس کے ساتھ ساتھ صلوٰۃ کا بھی تذکرہ ہے اور زکوٰۃ کا بھی تذکرہ ہے۔ قرآن میں کوئی ایک موقع بھی ایسا نہیں ہے جہاں عمل سے کنارہ کشی کی اجازت دی ہو۔ یہ کلیہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ کل نفس بما کسبت رھینۃ۔ "ہر انسان اپنی کوشش کا رہین منت ہے جتنی کوشش کرے گا وہ کوشش اس کے سامنے آئے گی"۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ وان سعیہ سوف یریٰ ثم یجزٰیہ الجزاء الاوفیٰ وان الیٰ ربک المنتھیٰ "انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کوشش کی اور اس کی کارگذاری دیکھی جائے گی۔ پھر اس کو پوری پوری جزا دی جائے گی۔ آخر میں تو اسے خدا ہی کے

سامنے جاتا ہے۔ خدا ہی کے سامنے اسے پیش ہونا ہے۔" لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت۔ "انسان کا نفس جو کچھ وہ حاصل کرے گا وہی اس کے کام آئے گا" جو کچھ اپنے ہاتھ سے اپنے لیے وہ کر رکھے گا وہی اس کے خلاف پیش کیا جائے گا۔ یعنی ثواب بھی عمل کا نتیجہ ہے۔ اور عقاب بھی عمل ہی کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنا ہی حاصل کیا ہوا ذخیرہ ہوگا اور اپنی روشن کی ہوئی آگ ہوگی۔ جو روزِ قیامت اس کے سامنے پیش ہوگی۔

حقیقت میں انسان کے عمل ہی ہیں جو بھیس بدل کر سامنے آجاتے ہیں۔ وہ وہی یہاں کے اعمال ہوں گے۔ جو صورتِ ثواب و عقاب میں پیش ہوں گے۔ اچھے عمل کیے صورت نیک سامنے آئی۔ برے عمل کیے صورت بری حاصل ہوئی۔ الدنیا مزرعۃ الآخرۃ۔ "دنیا کھیتی ہے آخرت کی" اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے یہ معنی ہیں کہ بیج جو آپ بوتے ہیں درحقیقت اس میں ایک دنیا مضمر ہے اس تمام کاشت کی جو آپ کے سامنے آئے گی۔ اسی طرح عمل صالح ایک تخمِ زراعت ہے جو زمینِ حیات میں بویا جاتا ہے۔ اور پھر اس کی پیداوار جزا کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی

اسلام کے معتدل قوانین

دنیا نے انسانی زندگی کے لیے جو لائحہ عمل تیار کیا اس میں مختلف نظریے کار فرما نظر آتے ہیں۔ بعض لوگوں نے انسانی حیثیت کو اسی موجودہ دنیا میں محدود سمجھ کر صرف اسی دنیا کی اچھائی اور خیر و برکت کو پیش نظر رکھا۔ انھوں نے اپنا نقطۂ نظریہ قرار دیا کہ اس دنیا میں رہو سہو، راحت و آرام اٹھاؤ۔ اس کے بعد کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ بے شک اگر انسان کی زندگی اسی طرح محدود ہے کہ اس کی ابتدا وقتِ ولادت سے ہوئی ہے۔ اور انتہا دنیا سے رخصت ہونے پر ہوتی ہے تو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اس وقت انسان کا مقصد انتہائی یہی موجودہ زندگی اور اس کا بہتر طریقہ سے گزارنا ہونا چاہیئے۔ کسی نے آخرت کا خیال اپنے پیش نظر کیا اور اس حد تک کہ موجودہ دنیا کی ضرورت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے موجودہ دنیا کی حیات کو کوئی چیز ہی نہیں سمجھا بلکہ جو کچھ بھی اہمیت دی وہ صرف آخرت کی زندگی کو۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے انسان کے لیے اسے عبادت قرار دیا، کہ انسان تمام دنیا سے بددل ہو کر تمام رشتوں کو توڑ کر پہاڑوں پر جا کر تنہائی میں زندگی بسر کرے۔ سخت ترین تکلیفوں کے ساتھ اپنے نفس کو ایذا پہنچائے۔ اس ایذائے نفسانی کو آخرت کی کامیابی کا ذریعہ سمجھا۔ ہندوستان کے بہت سے فرقوں میں اس قسم کی عبادتیں ملتی ہیں۔ جو صرف ایذائے نفسانی پر مبنی ہیں۔ آپ کو ملیں گے ایسے افراد جو خدا کی خوشنودی کے لیے اپنے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں اور اسی حالت پر باقی رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ خشک ہو

بجائیں اس سے وہ خدا کی رضامندی کے طالب ہوتے ہیں۔ آپ کو ایسے افراد ملیں گے جو آب و غذا ترک کردیتے ہیں اس حد تک کہ بالکل ضروریاتِ زندگی سے بے کار و معطل ہو جائیں اور اس سے وہ صرف خدا کی رضامندی کے طالب ہوتے ہیں۔ ہیں نے ایک عربی اخبار میں جو مصر سے نکلتا ہے ایک تصویر دیکھی کہ ایک شخص نے ایک تخت میں میخیں گاڑ رکھی ہیں ان پر وہ پاؤں رکھ کر بیٹھا ہوا ہے تاکہ وہ اس کے پیروں میں چبھیں۔ اور خدا کی رضامندی کا باعث ہو۔ ایسے بھی لوگ ملیں گے جو مندروں میں جا کر بچوں کو ذبح کرتے ہیں اور اس سے وہ خدا کی رضامندی کے طالب ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ عورتوں کے لیے سبب رضائے خدا قرار دیا گیا ہے کہ مرد کے مرنے کے بعد اپنے کو نذرِ شعلۂ آتش کردیں، اور اس طرح خدا کی رضامندی حاصل کریں۔ عیسائیت کی تعلیم اس وقت بھی انجیل کے صفحات پر موجود ہے اس سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص ملکوتِ آسمان میں داخل نہیں ہو سکتا جس کی شادی ہو گئی ہو اور وہ شخص ملکوتِ آسمان میں داخل نہیں ہو سکتا جس نے ایک وقت کھایا ہو اور دوسرے وقت کے لیے گھر میں رکھا ہو کہ صبح کو کھائیں گے۔ ان لوگوں نے درحقیقت عالمِ کائنات کی تصویر کے ایک ہی رخ پر نظر کی۔ آخرت ہی کو دیکھا اور آخرت ہی کو اپنے پیشِ نظر کیا۔ اور اس موجودہ دنیا کو اس قدر بے حقیقت اور بے وقعت قرار دے لیا کہ گویا خدا نے انسان کے لیے موجودہ زندگی جو قرار دی ہے وہ بالکل عبث اور بے کار ہے۔ اگر موجودہ دورِ زندگی کوئی قابلِ اعتبار چیز ہی نہ تھی تو قدرت نے انسان کے لیے یہ دورِ زندگی قرار ہی کیوں دیا؟ خدا کی ہر نعمت اس وقت تک جب تک کہ وہ نعمت ہے قابلِ قدر حیثیت رکھتی ہے۔ خدا کا کوئی کام عبث اور بے کار نہیں ہوتا۔ اس نے ہم کو یہ دورِ زندگی عطا کیا۔ اگر ہم کو مارنا ہی منظور تھا تو پھر زندگی عطا کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ درحقیقت کامیاب تعلیم وہی کہی جا سکتی ہے جو منشاءِ قدرت کو پورا کرنے والی ہو۔ وہی تعلیم صحیح ہو سکتی ہے جو نوع کو باقی رکھنے والی ہو۔ لیکن اگر تعلیم ایسی ہو کہ اس تعلیم پر عمل کرنے

سے نوع انسانی ہی فنا ہو جائے، تو ایسی تعلیم کبھی صحیح تعلیم نہیں کہی جا سکتی۔ اگر دنیا حقیقی طور سے پابندی اختیار کرے انجیل کی تعلیم کی یعنی انجیل کی تعلیم کے مطابق ہر شخص شادی کرنا موقوف کر دے، ہر شخص جنگل میں نکل جائے، پہاڑوں کے غاروں میں خدا کی عبادت میں مصروف ہو جائے تو چند روز میں نسل انسانی ہی باقی نہ رہے گی۔ نوع بشری ہی ختم ہو جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سلسلہ کائنات جس کو خدا نے اشرف المخلوقات قرار دیا تھا اس کا نقش ہی مٹ جائے گا۔ بھلا خدا اپنی طرف سے ایسی تعلیم کب دے گا جو خود اس کے مفادِ ایجاد کے خلاف ہو ایسی تعلیم کبھی خدائی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ حقیقتاً کامیاب تعلیم اور صحیح تعلیم وہی کہی جا سکتی ہے جو انسانی زندگی کو موجود رکھتے ہوئے نسل انسانی کو باقی رکھنے کی صورتیں پیدا کرتی ہو۔ اور آخرت پر توجہ بھی قائم رکھے۔ یہی وہ تعلیم ہو سکتی ہے جو نوعِ انسانی کی صحیح طور سے رہنما ہو سکتی ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ تعلیم کبھی غیر ممکن العمل نہ ہوگی۔ جو تعلیم عیسائیوں نے دی اس کے متعلق جب خود عیسائی عمل کر کے دکھا لیں تب ان کو حق ہوگا کہ ہمارے سامنے پیش کریں۔

ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ اقوام عالم اپنی اپنی مردم شماری کو زیادہ کرنے کی ضرورت محسوس کر رہی ہیں۔ آج عیسائیوں کی تعلیم پر جو قوم عمل کرے وہ دنیا سے ختم ہو جائے۔ عیسائیوں کی تعلیم جب خود عیسائیوں کے لیے غیر ممکن العمل ہے تو انھیں حق کیا ہے کہ دنیا کے سامنے پیش کر کے دعوتِ عمل دیں۔ یہ مسلمانوں کو فخر ہے کہ ان کی تعلیم اتنی جامع ہے اور اتنی منشاءِ قدرت کے مطابق ہے کہ اگر وہ دنیا کے سامنے پیش کریں تو ان میں کا ہر فرد اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ "میں اس پر عمل کر سکتا ہوں۔ اس لیے تم کو دعوت دیتا ہوں۔" یہ دنیا اور آخرت میں تفریق کر دی تھی کہ کسی نے دنیا کو سب کچھ سمجھا اور آخرت کو کچھ نہیں سمجھا اور کسی نے آخرت کو سمجھا اور دنیا کو کچھ نہ سمجھا، اسلام نے آ کر نقطۂ اعتدال پیش کیا کہ ہم نے جو تمھارے لیے موجودہ زندگی کو قرار دیا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانے کو

ناجائز نہیں قرار دیا۔ اس نے موجودہ زندگی کو محترم قرار دیا۔ اس نے موجودہ زندگی کو ایک عزتدار چیز قرار دیا۔ یہاں تک کہ خود انسان اگر کسی وقت اپنے نفس کو وقتی جذبات سے مجبور ہو کر ہلاکت میں ڈالنے کو تیار ہو جائے تو وہ روکتا ہے۔ لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ "خبردار! اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالنا۔ اس لیے کہ وہ ہمارے نفس پر ہم سے زیادہ حقدار ہے۔ ہمیں اپنے نفس کی کیا قدر؟ اسے قدر ہے جو درحقیقت اس نقش کا نقاش ہے اور یہ فطرت کا تعلق ہے کہ جو چیز کسی شخص کو بغیر محنت و مشقت کے مل جاتی ہے۔ اس کی کبھی قدر نہیں ہوتی۔ ہماری دولتیں کس طرح ہمارے ہاتھ سے گئیں؟ باپ دادا کی کمائی ہوئی تھیں ہم نے محنت نہیں کی تھی۔ ہم نے قدر بھی نہیں کی انھوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے حاصل کیا تھا۔ اس کو پانی کی طرح ہم نے بہا دیا اس لیے کہ ہمیں اس کی قدر نہ تھی اسی طرح نفس کا وجود، انسان کو اسکی کیا قدر؟ کسی اور کا عطیہ ہے انسان کو نعمت وجود عطا کر دی گئی ہے انسان ہر وقتی جذبہ سے متاثر ہو کر اس وجود کو فنا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ جو قدرشناس ہے اس کو وہ روکتا ہے، خبردار! تجھے کیا حق ہے کہ اس زندگی کو فنا کر دے میں نے یہ زندگی قرار دی ہے، مجھے حق ہے، اس نے انسانی زندگی کو محترم قرار دیا۔ قتل نفس کو بڑے سے بڑا گناہ قرار دیا۔ شرک کا مرادف قرار دیا۔ دوسروں کے نفس کو بھی محترم بنایا اور اپنے نفس کو بھی محترم بنایا۔ اپنے خاص عزیز رشتہ دار یہاں تک کہ اپنی اولاد تک کو قتل کرنے کا حق نہیں دیا۔ وہ مشرکین قریش تھے جو اپنی اولاد کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ اپنی لڑکیوں کو زندہ در گور کر دیتے تھے۔ اس ڈر سے کہ اگر زندہ رہیں تو سامان زندگی کہاں سے آئے گا۔ ممکن ہے کہ ذلت کی کوئی بات ہو جائے۔ اس لیے قتل کر دیا کرتے تھے۔ مگر اسلام میں منع کیا گیا۔ ارشاد ہوا۔ لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقکم وایاھم۔ "اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے قتل نہ کیا کرو۔ آخر تم کو بھی ہم ہی رزق دیتے ان کو بھی ہم ہی دیں گے۔"

لیکن یاد رہے کہ تاریخ اپنے کو پلٹا یا کرتی ہے۔ دنیا پچھلے پاؤں جا رہی ہے جس طرح
وہ جہالت کا دور دورہ تھا جب اولاد کو قتل کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اب بھی اولاد کو ختم کرنے کی
تدبیریں ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پرانی بدتہذیبیوں کو اچھائیوں کا بھیس پہنا دیا گیا ہے
پرانے زمانہ میں اگر اولاد کو قتل کیا جاتا تھا، تو اب ایسی صورتیں اختیار کی جا رہی ہیں کہ آنے
والا نفس دنیا میں آنے ہی نہ پائے۔ الدا اس کا پہلے ہی خاتمہ کر دیا جائے۔ نتیجہ میں دونوں ایک
ہیں۔ نقطۂ نگاہ متحد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ذہنیت ملتی جلتی ہوئی ہے۔ ہم اپنے نزدیک
سمجھ رہے ہیں کہ فکروں میں روشنی پیدا ہو رہی ہے۔ انسانیت ترقی کر رہی ہے لیکن ترقی کا
اصل نقطہ ہم سے بہت دور ہے۔ جس کو ہم ترقی سمجھ رہے ہیں وہ حقیقتاً تنزّل ہے
وہ بھی اقتصادی مشکلات سے ڈر کر قتل کرتے تھے۔ اب والے بھی ایسا ہی کرتے ہیں
پھر وہ اکثر ایک جذبۂ غیرت کے تحت میں لڑکیوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے تھے
مگر آج کل کی دنیا ایسی ہو گئی کہ لڑکیوں کو ہی نہیں بلکہ لڑکوں کو بھی فنا کرتے ہیں۔ آج کی دنیا کی
یہ عقلمندی ہے کہ جس طرح کمزور صنف کو فنا کرتے ہیں اسی طرح طاقتور صنف کو بھی اس
صنف کو بھی جس میں افراد کاسیہ پیدا ہوتے ہیں۔

بہرحال اسلام دونوں کا مخالف ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ جو نقش صفحۂ قرطاس
پر آئے وہ وجود کا حقدار ہے اس لیے کہ نقاش کا قلم غلطی نہیں کرتا۔ مٹا دینے
کے قابل وہ ہے جو حرفِ غلط کی حیثیت رکھتا ہو۔ لیکن جس کے قلم کی گردش نقطۂ
صحت پر ہو۔ اس کا نقش کبھی مٹانے کے قابل نہیں۔ جب رب چاہے تب فنا کرے
ہم کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کی کسی مخلوق کے فنا کا باعث قرار پائیں۔ اسلام نے یہ
اصول پیش کیا کہ موجودہ زندگی قابلِ احترام ہے۔ اسے صرف ایسے طریقہ سے صرف
کرنا چاہیے کہ وہ پیش خیمہ قرار پائے آئندہ زندگی کا۔ بے شک معصومینؑ کے کلام میں
دنیا کی مذمت وارد ہوئی ہے لیکن یاد رکھیے کہ مذمت "الحیوٰۃ الدنیا" کی ہے۔

"الحیوٰۃ الدّنیا" اس کے معنی ہیں وہ زندگی جو پست درجہ رکھتی ہے "حیوٰۃ الدنیا" مضاف، مضاف الیہ کی ترکیب کے ساتھ اسکے معنی ہوئے اس نشاۃ دنیا کی زندگی اسکی مطلق مذمت نہیں ہے۔ بلکہ "الحیاۃ الدنیا" وہ زندگی جو پست درجہ رکھتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ زندگی دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ زندگی جو پست درجہ رکھتی ہے قابلِ مذمت ہے اور ایک وہ زندگی جو بلند درجہ رکھتی ہے، وہ قابلِ مذمت نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تم اس دنیا میں اس طرح زندگی گزارو کہ "الحیاۃ الدنیا" رہے ہی نہیں۔ بلکہ وہ دنیا خود دین بن جائے۔ وہ دنیا منزلِ آخرت بن جائے ورنہ دنیا کی زندگی؟ وہ تو اگر نہ ہوتی تو آخرت کی منزل ہی نہ آتی۔ وہ دنیا کی زندگی وہی ہے جس سے انبیاء و مرسلین مستثنیٰ نہیں رہے ہیں۔ وہ زندگی درحقیقت سرچشمہ ہے تمام خیرات و برکات کا، وہ زندگی وہ ہے جس پر شکر کیا ہے شکر کرنے والوں نے جس وقت کوئی جنازہ نظر سے گزرے تو مستحب ہے کہ آہستہ سے اپنے دل میں یہ دعا پڑھیں۔ الحمد للّٰہ الذی لم یجعلنی من السواد المخترم "شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھ کو اس جماعت میں سے قرار نہیں دیا جو مردہ ہوئے ہیں رہا"

لوگوں کو اس کے معنی سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ بعض نے کہا کہ فنا ہونے کے معنی ہلاکتِ ابدی میں مبتلا ہونے کے ہیں لیکن موقع و محل سے یہ معنی کوئی تعلق نہیں رکھتے یعنی وہی ہیں کہ شکر ہے کہ مجھ سے نعمتِ زندگی سلب نہیں ہوئی ہے۔

یقیناً خدا کا ہر کام اس کے محل پر موجب شکر ہے جب تک زندگی ہے۔ زندگی قابلِ شکر ہے، اگر موت آجاتی تو موت قابلِ شکر ہوتی جب تک زندگی ہے خدا کی طرف سے وہ انسان کے لیے بہتر سے بہتر نعمت ہے۔ لا رھبانیۃ فی الاسلام "اسلام میں رہبانیت نہیں ہے" اس عبادت کو اسلام نے مستحسن قرار نہیں دیا کہ تمام نوعِ انسان سے علیحدہ ہو کر خدا کی عبادت کی جائے۔ عیسائیت کی وہ تعلیم کہ خدا کے ملکوت میں وہ داخل نہ ہوگا جو شادی کرلے۔ اسلام نے یہ کہا کہ "ہماری جماعت

سے وہ نہیں ہے جو شادی نہ کرے" یعنی جو پابند ہو اپنی شادی نہ کرنے کا وہ ہماری جماعت سے خارج ہے۔

اس طرح ثابت کیا کہ اسلام وہ ہے جو نوعِ انسان کے بقا کا ذمہ دار ہو کر آیا ہے فنا کا نہیں۔ وہ تعلیم کہ "جس نے ایک وقت کھایا اور دوسرے وقت کے لیے اٹھا کر رکھ دیا وہ ملکوتِ آسمان میں داخل نہیں ہو سکتا" اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔ اسلام بے شک مال و دولت کو خزانوں میں رکھنے کا مخالف ہے، وہ سرمایہ داری کا اس معنی میں مخالف ہے کہ تمام دولتوں کو سمیٹ سمیٹ کر خزانوں میں رکھا جائے۔ اسلام کے نقطۂ نظر میں مال و دولت فائدہ اٹھانے کے لیے ہے۔ اس لیے نہیں ہے کہ اس کو صرف دیکھ لیا جائے اور اسکے ہونے سے دل خوش کر لیا جائے۔

اس سرمایہ داری کے اسلام خلاف ہے۔ اس کی وجہ کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ اسلام انفرادی زندگی سے زیادہ اجتماعی زندگی کا حامی ہے۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلام میں زندگی کتنی محترم ہے۔ اسی لیے انسان کے لیے خود اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالنا ناجائز قرار دیا۔ نفس کو اگر کسی نقصان کا خوف ہے تو شرعی واجبات کو برطرف کر دیا جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے کہ وضو کا حکم ہے، نماز بغیر وضو کے صحیح نہیں ہے لیکن اگر خدانخواستہ کوئی مرض ہے تو حکم ہے کہ وضو نہ کرو، تیمم کر لو۔ اس طرح یہ بتایا کہ انسانی زندگی اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ ہم اپنی عبادت کی شکل و صورت کو بدل دیتے ہیں تمہاری زندگی حفاظت کیلئے وہ مرض بھی کوئی ایسا مرض نہیں جو لاعلاج ہو۔ ایسا بھی نہیں کہ سخت دشوار ہو امراض مزمنہ نہیں جن کا علاج ممکن نہ ہو۔ معمولی سی تکلیف جو مرض سمجھی جا سکے، اس کو بھی قدرت نہیں گوارا کرتی۔ سفر میں انسان کی طبیعت پر دشواری ہوتی ہے یہ خیال نہ کیجیے کہ سابقہ زمانہ کا سفر اس میں صعوبتیں تھیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود سفر کے مفہوم میں ایک گرانی داخل ہے سا سی فطرتِ انسانی کی نباضی کرتے ہوئے سفر میں چو رکعتی نمازیں نصف کر

دی گئیں۔ یونہی روزے بلا عذر نہیں چھوڑے جا سکتے تھے، سفر میں چھوڑ دو، پھر کبھی رکھ لینا۔

اس طرح بتلایا کہ تمھاری جسمانی زندگی کہاں تک عزیز ہے۔ اس طرح تمام ان غلطیوں کا سدِ باب کیا جو خدا کی رضامندی کو انسان کی ایذائے نفس میں منحصر قرار دیتی تھیں وہ دنیا کا نظریہ کہ جتنا ہم اپنے نفس کو خواہ مخواہ کی تکلیف دیں گے اتنا ہی خدا ہم سے رضامند ہوگا۔ اسلام نے غلط ثابت کیا۔ اس نے ہمارے لیے ہر طرح کی آسانیاں قرار دیں۔ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ "خدا تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔" اس نے اسی نوعیت کے قوانین قرار دیے کہ کسی حکم شرعی کی تعمیل میں غیر معمولی دشواریاں اور اعذار پیدا ہو جائیں تو ہم اس کو برطرف کر دیں گے۔ "ما جعل اللہ علیکم فی الدین من حرج" "تمھارے لیے مذہبی احکام میں عسر و حرج نہیں قرار دیا گیا ہے۔" یہ قاعدہ بنا دیا اور کلیہ قرار دے دیا۔ یہی اسلام کی ہمہ گیری اور بقا کی دلیل ہے۔ اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت جامع اور مکمل ہے۔

یقیناً اسلام کی شریعت اس مختصر مجموعۂ قرآن کے اندر ہے جو ہماری نظروں میں ایک محدود کتاب ہے اور ان احادیث میں ہے جن کا اگر ذخیرہ جمع کیا جائے جو صحیح اور قابلِ اعتبار ہیں تو وہ بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ اس میں دنیا کے تمام جزئیات یعنی خاص خاص مواقع کے احکام نام لے کر تو مذکور نہیں ہیں لیکن کلیات کے تحت میں دنیا کے ضروریات باعتبار موقع و محل سب بتلا دیے ہیں۔ لیکن اسلام کی شریعت میں کلیات و قواعد اتنے واضح موجود ہیں کہ ایک سمجھنے والا انسان ہر موقع و محل کی مناسبت سے ان کلیات سے احکام نکال سکتا ہے۔ اسی بنا پر وہ شریعتیں جو اس سے قبل تھیں وہ اس کی حقدار نہ تھیں کہ ہمیشہ کے لیے رہنمائی کر سکیں اس لیے کہ ان کے ضروریات

محدود تھے، اور اسی لیے احکام بھی محدود۔ شریعت اسلام نے ایسے احکام و قوانین قرار دیے
جو ہر موقع پر اور ہمیشہ رہنمائی کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ یقیناً ہم کو کبھی شریعت میں تبدیلی
کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم کو کبھی حکم اسلام کے علاوہ ضرورت کے موقع پر کسی خاص حکم کے بنانے
کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر موقع کے لحاظ سے خود شریعت اسلام میں احکام موجود ہیں اسی
لیے یہ ضروری ہے کہ ہر زمانہ میں جس واقف کار سے احکام دریافت کیے جائیں وہ وہی ہو کہ
جو اس زمانہ میں موجود ہو اور نتیجہ نکالنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اجتہاد
کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ تاکہ اسلامی شریعت کا جوہر خاص کہ وہ ہمیشہ رہنمائی کر سکے باقی رہے
اسلام کے احکام ہرگز دشواری اور سختی پر مبنی نہیں ہیں مگر یاد رکھیے کہ ایک دشواری وہ ہوا کرتی
ہے جو پابندی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ ہر آسان سے آسان چیز پر جب پابندی عائد ہو جائے
تو طبیعت پر گراں گزرتی ہے، یہ پابندی وہ ہے جو حکم کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ دشواری وہ ہے
جو حکم سے جدا نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے حکم کا نام تکلیف رکھا گیا ہے، کہ وہ انسان کی طبیعت
پر ایک بار ضرور ہوگا۔ صرف پابندی کی بنا پر اس قسم کی سختی جو اصل پابندی کا نتیجہ ہو وہ
اسلام کی طرف سے برطرف نہیں ہے اس لیے اصل احکام شریعت کے مقابلہ میں دنیا
اگر عسر و حرج کے نفی والی آیتوں کو پیش کرے تو وہ استدلالی غلطی ہے اگر ہم حدیث
سے پردے کو ثابت کریں اور کہا جائے کہ خدا تو کہتا ہے مایرید بکم العسر پھر یہ
سختی کیسی، تو یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ وہ سختی جو کسی حکم کا لازمی نتیجہ ہو وہ برطرف نہیں ہے
بلکہ کسی حکم شرعی کی پابندی میں غیر معمولی صورتوں کے لحاظ سے اور اتفاقی مواقع کی
حیثیت سے غیر معمولی سختی پیدا ہو تو وہ برطرف ہے۔

اگر ما یرید اللہ بکم العسر اور ما جعل علیکم فی الدین من
حرج اس کا مفہوم اتنا ہی عام ہوتا تو پوری شریعت ہی ختم ہو جاتی۔ اسلام نے ہر
حیثیت سے ہمارے لیے آسانیاں قرار دیں۔ شریعت نے یقیناً ہمارے تقاضائے انفرادی

کا احترام کیا مگر اجتماعی زندگی کے مقابلہ میں وہ انفرادی زندگی کو کوئی چیز نہیں سمجھتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس وقت مرکزِ اجتماعی پر مصیبت آ رہی ہو جس وقت کہ ہیئتِ اجتماعی پر کوئی بلا آ رہی ہو تو اس مفادِ اجتماعی کے بقا کے لیے اس انفرادی زندگی کو فنا کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے یہ جہاد کا حکم کیا ہے؟ وہ انسان کی انفرادی زندگی جس کی حفاظت کے لیے احکام میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں، آج وہ موت کے منہ میں بھیج دی جاتی ہے۔ آج وہ سلاح جنگ کے مقابلہ میں بھیج دی جاتی ہے۔ فنا ہونے کے لیے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ مفادِ اجتماعی کے مقابلہ میں مفادِ انفرادی کوئی چیز نہیں ہے۔

اسلام نے بے شک انسان کے لیے مال و دولت کو جائز قرار دیا ہے مگر اس وقت تک کہ انفرادی ترقی اجتماعی ترقی کے خلاف نہ ہو جائے اسلام کا نقطۂ نظر انسان کی زندگی کے متعلق یہ ہے کہ ہر شخص ترقی کرے۔ ایک فرد رہتے ہوئے اس نوع کی جس کی وہ ایک ہستی ہے، اس لیے کہ قوم تو افراد کا مجموعہ ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا افراد کی ترقی قوم کی ترقی ہوئی۔ مگر اسی وقت جب احساسِ قومیت کے ساتھ ہو۔ اور اگر احساسِ قومیت ساتھ نہ ہو تو افراد کتنی بھی ترقی کر جائیں قوم پھر بھی پستی کی حالت میں ہوگی۔ کیونکہ قوم تو نام ہے رشتۂ اجتماعی کا۔ جو مختلف افراد میں اتصال رکھتا ہے۔ اجسام کا اجتماع، باہمی نشست کی حیثیت سے اور مکان کی قربت کے لحاظ سے ایک قوم کے افراد نہیں بنا دیتا۔ پھر جبکہ ایک قوم کی تشکیل اس رابطہ کی وجہ سے ہوتی ہے جو ان افرادِ قومی میں بحیثیت شیرازۂ قومی کے قائم ہو تو جب تک یہ رابطۂ باہمی قائم ہے قوم ہے اور اگر یہ ختم ہو تو قوم فنا ہو گئی چاہے اس کے افراد کتنے ہی موجود ہوں۔

اسی لیے اسلام ایسی ہی زندگی کو چاہتا ہے جو احساسِ قومیت کے ساتھ ہو۔ اگر آپ نے مال و دولت انفرادی حیثیت سے خزانوں میں بھر کر رکھ لیا جس سے نہ آپ کو فائدہ پہنچا ہے نہ دوسروں کو تو یہ مال و دولت آپ کے لیے سببِ ترقی ہے لیکن بحیثیت قوم آپ کے

لیے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ سرمایۂ زندگی جو مال و دولت ہے اس کی مثال خون کی طرح ہے جسمِ انسان میں۔ جس طرح یہ جب تک جسمِ انسان میں گردش کرتا ہے اور شریان و عروق میں چلتا پھرتا ہے اس وقت تک اس جسم کی زندگی ہے اور اگر یہ خون کسی جگہ اس جسم میں منجمد ہو کر رہ جائے اور دوسرے اعضاء و جوارح اس سے محروم رہ جائیں تو یہ اس جسم کا مرض ہوگا اور اس کی فنا کا پیش خیمہ قرار پائے گا۔ اسی طرح اگر یہ خون کسی منفذ کو پاکر باہر بہنے لگے تو پھر انسان کا جسم فنا ہو جائے گا۔ ان میں سے ہر ایک مرض ہے انسانی زندگی کو فنا کرنے کا۔ یہ تمام امراض ہیں مستقل۔ ایک یہ کہ خون منجمد ہو کر ایک جگہ رہ گیا۔ انسان مفلوج ہو گیا، کچھ اعضاء بیکار ہو جائیں گے۔ نتیجہ میں وہ اعضاء بھی جو اس وقت خون رکھتے ہیں فنا ہو جائیں گے۔ ایک یہ ہے کہ کوئی ایسی رگ قطع ہو گئی کہ خون بہنے لگا۔ پھر بھی انسانی زندگی فنا ہو جائے گی۔ ان میں سے ہر ایک وہ ہے جو انسانی زندگی کو فنا کرنے کا باعث ہے وائے برحالِ قوم! جب کہ تنے امراض پیدا ہو جائیں تو کبھی ان افراد کو اپنی زندگی پر ناز کرنا چاہیئے۔ ایک طرف یہ مرض کہ بعض لوگ صاحبِ دولت بن بیٹھے، انھوں نے مال و دولت خزانوں میں محفوظ کر لیا، دوسرے فاقے کرتے ہیں تو ان کی بلا سے، مگر ان کو یہ گھمنڈ نہ کرنا چاہیئے کہ ہمارے پاس مال و دولت ہے۔ اس لیے کہ قوم اگر فنا ہو گئی تو کوئی فرد چھوٹے گا نہیں۔ یہ سب بحیثیت افرادِ قوم فنا ہو جائیں گے۔ اور اس کے باعث وہ خود ہوں گے۔

دوسری طرف درآمد برآمد کا عدم توازن ہماری آمدنی کم اور مصارف زیادہ۔ ہمارا سرمایۂ زندگی دوسروں کے پاس چلا جا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک وقت میں ہمارا جتنا سرمایہ ہے وہ سب چلا جائے گا۔ جائدادیں چلی گئیں، مکانات چلے گئے زمینیں چلی گئیں، سود در سود کے ذریعہ سے ہمارا جتنا سرمایہ تھا وہ سب دوسروں کے پاس چلا گیا۔ تجارت چھوڑ دی، اسے عار و ننگ سمجھ لیا۔ اسی طرح جتنے ذرائعِ آمدنی کے تھے ترک کر دیے۔ گر

ضروریات قائم، سرمایہ ختم ہو چکا، پرونوٹ پر روپیہ لیا۔ سود در سود مقرر کیا۔ اسلام کی تعلیم پر ہم نے عمل نہیں کیا۔ اسلام نے ہمارے لیے سود دینا اور لینا حرام قرار دیا تھا ہم نے اسلام کی اس تعلیم سے غلط فائدہ اٹھایا کہ غیر مسلم سے معاملت جائز ہے۔ اس کے معنی یہ ہم نے سمجھے کہ سود دینا جائز ہے حالانکہ ہرگز ایسا نہیں۔ غیر مسلم کو سود دینا تو دو حیثیتوں سے حرام ہے۔ ایک طرف سود ہونے کی وجہ سے حرام ہے دوسری طرف اعانتِ کفار ہونے سے حرام ہے۔ ایک طرف گناہ کیا دوسری طرف اعانتِ کفار کے باعث ہوئے۔

اس طرح ہم اپنے ہاتھوں سے فنا کی منزل پہ پہنچے۔ ہم نے ایک "ضرورت" کا لفظ سن لیا کہ ضرورت کے وقت سود جائز ہو جاتا ہے۔ لیکن ضرورت کے معنی ہم نے یہ قرار دے لیے کہ بچہ کا ختنہ ہے، ضرورت ہے ہمیں قرض لینے کی۔ صاحبزادے کی شادی ہے ہمیں ضرورت ہے قرض لینے کی۔ "منت" مانی ہے، منت پوری ہوگئی، ضرورت ہے۔

اگر ضرورت کے یہ معنی ہیں تو بغیر ضرورت کے کوئی قرض ہی کاہے کو لینے لگا؟ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سود ناجائز ہی نہیں "حقیقتاً ضرورت" وہ ہے جس کے موقع پہ کہا جاتا ہے کہ "مردار کھانا جائز ہے" جس وقت کہ آپ مردار کھا سکتے ہیں اس وقت سودی روپیہ لینا بھی جائز ہے۔ بغیر اس کے کسی وقت بھی جائز نہیں۔ اگر ہم اسلام کے قوانین پر عمل پیرا ہو جائیں تو آج بھی ہمارے لیے وہ زندگی پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر جب ہمیں خبر ہی نہیں تو نتیجہ فنا ہے اور کچھ نہیں۔

دین و دُنیا

دین و دنیا کے معاملہ میں کچھ لوگوں نے صرف آخرت پر نظر کی۔ دنیا کو نظر انداز کر دیا۔ کچھ لوگوں نے موجودہ حیاتِ دنیا پر نظر ڈالی۔ اسلام نے اس معاملہ میں ایک معتدل حکیمانہ طرزِ عمل یہ پیش کیا کہ تم اس دنیا کی زندگی کے تمام ان لوازم کے ساتھ جو اس دنیا کے لیے ضروری ہیں زندگی بسر کرو مگر اس کے ساتھ ساتھ آخرت کے خیال کو بھی نہ بھلاؤ۔ تمام وہ تعلقات جو انسان کو دنیاوی زندگی کے ساتھ حاصل ہیں، تمام وہ ضروریاتِ زندگی جو قدرتی قویٰ کے لحاظ سے انسان کے لیے لازم ہیں ان کے دروازے بند نہیں کیے گئے۔ قدرت نے اگر قوتِ ذائقہ عطا کی تھی تو غذا سے منع نہیں کیا۔ قوتِ سامعہ عطا کی تھی تو آوازوں کے سننے سے روکا نہیں۔ ہر طاقت جو عطا کی تھی اس سے فائدہ اٹھانے کا انسان کو حق دیا۔ احل لکم الطیبات۔ "تمھارے لیے پاک و پاکیزہ دنیا کی جتنی چیزیں ہیں وہ حلال ہیں"

قل من حرم زینۃ اللّٰہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق

"ان سے کہو کون ہے جس نے حرام کر دیا ہے خدا کی پیدا کی ہوئی زینتوں کو اور پاک و پاکیزہ رزق کو جو خدا نے عطا کیا ہے اس نے بہتر سے بہتر غذا کھانے کا حق دیا، بہتر سے بہتر لباس پہننے کا حق دیا۔"

لیکن ہر چیز میں اپنی طرف سے ایک پابندی قرار دے دی تاکہ ہر چیز سے لذت اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ فرض شناسی کا بھی احساس رہے۔ آپ کو بہتر سے بہتر غذائیں کھانے کا حق دیا۔ مگر احل لکم الطیبات و حرم علیکم الخبائث کی تفریق قرار دے کر اس میں ہر موقع پر اپنی یاد بھی دلا دی۔

اگر آپ جائزہ لیجیے تو وہ چیزیں جو ماکول اللحم میں داخل ہیں اپنے مزے کے اعتبار سے کوئی پست درجہ نہیں رکھتیں۔ ان میں بہت لذیذ چیزیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو شئے ممنوع ہی میں لذت محسوس ہو۔ الانسان حریص علی ما منع وہ لذت اعتباری لذت ہوتی ہے جو شئے ممنوع سے پیدا ہوتی ہے لیکن واقعی طور پہ اگر دیکھا جائے تو ان چیزوں میں جن کو قدرت نے جائز قرار دیا ہے لذت مفقود نہیں ہے، لیکن پھر بھی روک دیا۔ ان چیزوں سے جو اس کی نظر میں حکیمانہ حیثیت سے انسانی زندگی کے لیے مضر تھیں، ان کو روکنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ انسان بہتر سے بہتر غذا ڈھونڈ کر یہ احساس رکھے کہ کلوا واشربوا ولا تسرفوا اس طرح انسان نے لذت بھی حاصل کی اور فرض شناسی کے ساتھ خدا سے بھی لو لگائے رہا۔ اسے بہتر سے بہتر لباس پہننے کی اجازت دی مگر پابند کر دیا کہ ریشم نہ پہنو۔ اس کے بعد آپ بیش قیمت سے بیش قیمت لباس پہنیے کوئی اعتراض نہیں۔ انسان ڈھونڈے، عالم کے بازاروں میں بہتر سے بہتر لباس اپنے لیے اختیار کرے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کا خیال لگا رہے کہ حریر محض نہ ہو۔ اجزائے غیر ماکول اللحم سے نہ ہو۔ اس طرح انسان نے لذت دنیا کو بھی حاصل کیا مگر خدا کو بھی نہیں بھولا۔ اس کے بعد انسان کے لیے قدرت نے نظام بشری کی اصلاح کے لیے ایسے ضروریات مہیا کیے کہ جن کی وجہ سے نسل انسانی کے جو دو طبقے قرار دیے ہیں صنف ذکور و اناث، ان کا ربط پیدا ہو سکے۔ انجیل کی تعلیم اپنے مقام پر کہ "وہ ملکوت آسمان میں نہیں داخل ہوگا جو شادی کرلے"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو تفرقہ قدرت نے قرار دیا تھا وہ عبث ہے، خدا کا ایک طرز عمل بیکار قرار پاتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نسل انسانی فنا کی منزل کے قریب آجائے۔ مگر پیغمبر اسلامؐ کا یہ ارشاد النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری جماعت سے وہ شخص خارج ہے جو انکار رکھتا ہو شادی کرنے سے۔ اس طرح نسل انسانی کے باقی رکھنے کی فکر کی گئی۔

لیکن ایسی پابندیاں عائد کردی گئیں جو نظامِ بشری سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً شوہر دار عورت سے عدم جواز کا حکم، غیر شوہر دار سے عقد کرنا جائز لیکن اس میں بھی خاص الفاظ اور صیغے مقرر کر کے یہ بتایا ہے کہ اگر انسانی خواہشیں پوری ہوں بھی تو فرض شناسی کے احساس کے ساتھ۔ یعنی صیغۂ خاص کا حکم اس لیے تھا کہ انسان کی وہ خواہشیں جن کی حیثیت یہ ہے کہ خدا کی یاد کو بھلا دیں ان کی تکمیل میں بھی خدا کی یاد فراموش نہ ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں خالص مادی حیثیت رکھتی تھیں ان میں اسلام نے اپنے حکیمانہ طرزِ عمل سے روحانیت کی روح پھونک دی۔ اس سے بڑھ کر کیا فرض شناسی کی تعلیم ہوگی؟

ایک وہ محل و موقع جہاں پر تمام موانع مرتفع ہیں کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ مگر انسان کو اس وقت بھی یاد آجاتا ہے کہ ہمارے خدا کا حکم ہے کہ کچھ الفاظ زبان پر جاری کر لیے جائیں اس وقت تک ہمارے لیے اقدام کرنا مستحسن نہیں ہے۔ اس طرح اسلام نے دنیا کو سمو دیا آخرت میں اور انتظام کیا کہ تم اپنی ذاتی خواہشوں کو پورا کرو مگر احساسِ فرض کو بھی نہ چھوڑو۔ خدا کی یاد دل سے نہ نکلنے پائے، بے شک ایسی چیز دل سے روکا جو طبعاً خدا کو بھلا دیتی ہیں، لہو و لعب سے منع کیا۔ لہو کو لہو اسی لیے کہتے ہیں کہ یلھی عن ذکر اللہ "وہ خدا کی یاد سے غافل بنا دیتا ہے"۔ لیکن ذرائع صحتِ جسمانی کو جائز رکھا اور ذرا ذرا سی باتوں میں بھی انسانی ضروریات کا لحاظ رکھا۔ وہ کسی طرح اس چیز میں اپنی خوشنودی و رضامندی نہیں سمجھتا کہ خواہ مخواہ آپ اپنے نفس کو تکلیف دیجیے۔ مثلاً دو گھنٹے دھوپ میں کھڑے ہو جیے، اس لیے کہ خدا راضی ہو۔ خدا اس سے راضی نہیں ہوگا۔ بے شک ان فرائض کے سلسلہ میں جو اس نے عائد کیے ہیں۔ اگر تکلیف ہو تو جتنی تکلیف ہوگی اتنا ہی اجر بھی بڑھ جائے گا مستقل طور سے صرف تکلیف ہی حاصل کرنا اپنے مدِ نظر نہ رکھیے، اپنے مدِ نظر فرائض کا ادا کرنا ہی رکھیے۔ افضل الاعمال احمزھا "سخت ترین عمل وہ ہے جو زیادہ تلخ ہو"۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ زیادہ تکلیف اختیار کیجیے۔ نہیں بلکہ ادائے

فرض کے سلسلہ میں تکلیف اٹھانا پڑے تو فرض کو نہ چھوڑیئے۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ آپ کی نظر میں فرض کہاں تک اہم ہے۔

اس طرح نہ انسانی ضروریاتِ زندگی کو نظرانداز کیا گیا نہ آخرت کا خیال نظرانداز کیا گیا۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام مال و دولت جمع کرنے سے مانع ہے۔ یعنی مال و دولت کی طرف توجہ ہی کو ناجائز قرار دیتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ بے شک وہ ان دونوں افراط و تفریط کے نقطوں سے علیحدہ ہے جو اس وقت دنیا میں پائے جا رہے ہیں ایک طرف وہ سرمایہ داری جو اس وقت امریکہ وغیرہ میں پائی جاتی ہے اور دوسری طرف روس کی اشتراکیت۔

بعض لوگ جنھوں نے اسلامی تعلیمات کا پورے طور سے مطالعہ نہیں کیا ہے وہ روس کی اشتراکیت کو اسلام کے سر منڈھنا چاہتے ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ روس کی اشتراکیت اسلام کا حکم ہے۔ اسی طرح اس کے خلاف بعض لوگ ایسے ہیں جو اسلام کو سرمایہ داری کا حامی بتلاتے ہیں۔ درحقیقت لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کی صحیح روح کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اسلام جس طرح ہر چیز میں ایک نقطۂ اعتدال کو پیش کرتا ہے۔ اور اسی میں اس کی حقیقی کامیابی کی روح مضمر ہے۔ اسی طرح اس اشتراکیت و سرمایہ داری میں وہ ایک نقطۂ اعتدال کا حامل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اسلام اشتراکیت کا حامی ضرور ہے۔ لیکن خود اختیارانہ اشتراکیت کا جبریہ اشتراکیت کا نہیں۔ اس کی توضیح مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ حضرتِ احدیت نے دنیا کو عالمِ اسباب قرار دیا ہے۔ اور اسباب پر نتائج کو مرتب قرار دیا ہے۔ اسلام کی شریعت چونکہ قانونِ فطرت کی پابند ہے اس لیے اس نے بھی ہر شے کے لیے کچھ اسباب مقرر کر دیے ہیں۔

اگر ایسے اسباب مجتمع ہو گئے تو شریعت اپنے قانون کے موافق ان نتائج کو

مترتب کرے گی جو اُن اسباب سے تعلق رکھتے ہیں۔ شریعت نے جس طرح ہر چیز کے لیے نتائجُ قرار دیے ہیں اسی طرح ملکیت کے لیے بھی کچھ اسباب قرار دیے ہیں۔ بے شک اس نے ہر شخص کو دعوت دی ہے کہ میدان عمل میں آ کر ایک دوسرے پر سبقت اختیار کرے۔ درحقیقت کامیابی کا جوہر مسابقت میں ہے۔ زندگی کا رمز ایک دوسرے کے آگے بڑھنے میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر اس نے اپنی طرف سے چپہ چپہ برابر تقسیم کر دیا ہوتا تو پھر عمل کا میدان ہی کہاں رہتا۔ پھر سعی کی کوشش کے لیے وسعت ہی کہاں باقی رہتی۔ اس لیے اس نے مال و دولت کو تمام قیود سے آزاد، بغیر کسی مالک خاص کے اپنا قرار دیا۔ یعنی جتنی دنیا کی چیزیں ہیں وہ ان تمام اسباب سے قطع نظر کر کے کس شخص کی ہیں؟ خدا کی، ان الارض للّٰہ" زمین خدا کی ہے۔ دنیا میں جو کچھ مال ہے وہ سب خدا کا ہے۔ ہر چیز عالم کی صرف اس کی ذات سے مخصوص ہے دولت خزانہ جتنی چیزیں ہیں وہ سب اسی کی ہیں۔

اس کے بعد اس نے موقعہ دیا اور اسباب قرار دیے کہ وہ چیزیں جو میری ہیں دنیا کی وسعت جو مجھ سے مخصوص ہے اس میں سب کا حق ہے اور کسی کا بھی نہیں ہے اس طرح اس نے دنیا کو موقع دیا آگے بڑھنے کا۔ پھر اسباب مقرر کیے جن کے ذریعہ سے کوئی شئے کسی کی قرار پا سکتی ہے۔ زمینیں ہیں وہ ان ذرائع سے ملکیت قرار پا سکتی ہیں کسی شخص کی، خزانے ہیں وہ اس طرح سے، درخت ہیں وہ اس طرح سے، شروع میں تو کسی کا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد اسباب مقرر کیے گئے۔ اسباب میں کسی کا نام نہیں قرار دیا گیا۔ کہ فلاں شخص کی یہ ملک ہوگی۔ بلکہ جو اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مقدار میں ان نتائج کو حاصل کر سکے۔ جو قدرت نے ان اسباب کے لیے مقرر کیے ہیں۔ اس طرح میدانِ عمل میں سابقت کی دعوت دی کہ آؤ اس میدانِ عمل میں اند اسباب موجود ہیں۔ اسباب کے ذریعہ سے نتائج حاصل کرو۔

اب اگر کسی شخص نے افراد انسانی میں سے اپنی قوتِ عمل کو بیکار رکھا، معطل رکھا، خدا کی دی ہوئی چیزوں سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اور دوسرے شخص نے عمل کیا۔ ان اسباب سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا۔ ان ذرائع عمل کو اختیار کیا جس کے ذریعہ سے مال و دولت بیشتر حاصل ہوتی ہو تو قدرت یہاں پر بے انصافی سمجھتی ہے کہ وہ برابر کردے ان دونوں کو۔ اگر کسی شخص نے اس مال و دولت کو ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہے تو بے شک اس کی ہر ایک چیز اس اصلی مالک کی ہے جس سے اس نے ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہے۔ لیکن اگر جائز ذریعہ سے کسی نے اپنے مال و دولت میں اضافہ کیا ہے اور دوسرے شخص نے ان ذرائع سے حاصل نہیں کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ قانون گردن پکڑ کر اس کی تمام مال و دولت کو تقسیم کردے دوسرے لوگوں میں جن کا اس عمل میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ ہاں! ان لوگوں کو مخاطب کر کے جنھوں نے مال و دولت حاصل کیا ہو ایسے احکام و فرائض عائد کردیے کہ وہ خود بارادہ و اختیار خود اپنی خوشی سے ان لوگوں کی جو درحقیقت اپنی ذاتی کوتاہی سے یا اسباب کی کمی سے یا حوادث اتفاقیہ سے اس معیار بلندی پر نہیں آسکے۔ اور فقر و فاقہ کی دشواریوں کو اٹھا رہے ہیں کفالت کریں۔ خالق کا ارشاد ہے کہ الاغنیاء امنائی والفقراء عیالی۔ مال و دولت رکھنے والے میرے امانتدار ہیں اور فقیر میرے واجب النفقہ ہیں (حدیث قدسی)

اس طرح اشارہ کیا کہ اگر کسی نے کسی فقیر کی خبر گیری کی تو گویا اس نے میرے سوال کو پورا کیا۔ اس لیے کہ کسی کے واجب النفقہ کی آپ خبر گیری کردیجیے تو اس کو گویا دیدیا۔ ایک مرتبہ ارشاد ہوا، اے موسیٰ! اگر میں تمھارے دروازہ پر آؤں تو کیا دوگے؟ موسیٰ کانپ گئے۔ جواب کیا دیں۔ ارشاد ہوا۔ اگر کوئی فقیر تمھارے دروازے پر آئے تو سمجھو کہ میں آیا ہوں۔ اس طرح اغنیاء کے اموال میں فقیروں کو شریک قرار دیا۔ لیکن

یہ وہی شرکتِ خود اختیاری ہے۔ اس طرح اس شخص کی محنت کا پھل بھی دے دیا جس نے اپنی ذاتی محنت و مشقت سے روپیہ کمایا تھا اور اس فقیر کی ضرورت کو بھی پورا کر دیا جو اس میدانِ عمل میں پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کے بعد زکوٰۃ و خمس کے احکام جاری کیے۔ یہ احکام ایسے ہیں کہ اگر ان پر صحیح طریقہ سے عمل ہوتا رہے تو مسلمانوں میں کوئی شخص بھیک مانگنے پر مجبور نہ ہو۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اغنیاء اپنے فرائض کا احساس نہ کریں وہ خدا کے دیے ہوئے مال و دولت کو اس طرح سمجھیں کہ گویا وہ کسی دوسرے محسن کے دست نگر نہیں ہیں۔ وہ بیکار کے مصارف میں کتنا ہی صرف کر دیں کتنا ہی زیادہ سے زیادہ مقداریں دے دیں بطور پیشکش کے بڑی بڑی ہستیوں کو کتنا ہی وہ اپنے خزانہ سے بھر دیں لیکن زکوٰۃ و خمس کے نام سے دینا نہیں نصیب ہوتا۔ وہ علمِ حساب حاصل کرتے ہیں مگر اپنی آمدنی اور صرف کے لیے نہیں۔ انھوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا تھا اس میں خدا کی طرف سے ہم پر کیا عائد ہوا تھا۔ وہ سرکاری حکام کے ٹیکسوں کو خوب ادا کرتے ہیں۔ چاہے اس لیے کہ اس میں قرقی اور وارنٹ کا خوف ہے۔ لیکن خدا کی طرف کا جو مطالبہ ہے اس پر نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ علماء کی زبانیں بھی اس معاملہ میں خاموش۔ اس اندیشہ میں کہ لوگوں کو خیال ہوگا یہ اپنے لیے کہتے ہیں۔

مگر میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ زکوٰۃ و خمس کے روپیہ کو آپ کسی مجتہد کے سامنے پیش کریں۔ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ مجتہد مستحق کی شناخت میں آپ سے زیادہ ناواقف ہو۔ آپ کو ذاتی طور پر لوگوں سے ملنے جلنے کا زیادہ موقع ہے آپ مستحق و غیر مستحق سے بہ نسبت اس جماعت کے زیادہ واقف ہیں جو گوشہ گیر ہو جو ظاہر پر عمل کرتی ہو جس کے سامنے لوگ جا کر زیادہ پابندیٔ مذہب کا اظہار کرتے ہوں اس لیے کہ معلوم ہے کہ ملے گا تو یہیں سے ملے گا۔ بہت ممکن ہے کہ مستحق کی شناخت آپ کو زیادہ ہو۔ اس لیے آپ زکوٰۃ و خمس کے احکام کو کتابوں میں دیکھ لیجیے یا کسی مجتہد

سے پوچھ لیجیے۔ لیکن اس کے آپ کبھی منتظر نہ رہیئے کہ ہم ان کے پاس پیش کریں۔ بلکہ آپ اگر اپنے اور خدا کے درمیان اپنے ذاتی احساس ذمہ داری کے ساتھ اس کو صحیح مستحقین تک پہنچا سکتے ہیں تو آپ اپنی ذمہ داری سے ادا ہو جائیں گے۔ چاہے آپ کسی عالمِ دین کی صورت بھی نہ دیکھیں مگر زکواۃ وخمس ادا کیجیے، آپ شہر میں نہ دیجیے، بیرونِ شہر میں دیجیے۔ اگر شہر کا حق مقدم ہوتا ہے لیکن بہر حال ادا تو کیجیے۔

اگر آج اس پر عمل ہوتا تو یہ حالت نہ ہوتی۔ لیکن وہ اشخاص جنھوں نے گداگری کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ وہ لوگ نظرِ قدرت میں ایک سخت معصیت کے مرتکب ہوتے ہیں جو قریب بہ شرک ہے۔ اس لیے کہ یہ خدا کو چھوڑ کر دوسرے کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں اگر وہ نماز کے پابند ہیں تو کہتے ہوں گے "ایاک نعبد وایاک نستعین" "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے امداد طلب کرتے ہیں" لیکن گداگری سے ظاہر ہے کہ خدا پر بھروسا نہیں ہے۔ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ سوال کرنا اسلام میں وہ چیز ہے کہ جس وقت مردار حلال ہوتا ہے اس وقت سوال کرنا جائز ہو سکتا ہے۔ ورنہ گداگری اسلام میں جائز نہیں ہے۔

لیکن پھر بھی کیا کہنا اس کے تفضّل کا۔ ایک طرف تو گداگری کو اتنی بڑی معصیت قرار دیا لیکن دوسری طرف یہ حکم دیا کہ اب اگر اس نے اس معصیت کا ارتکاب کیا ہی ہے۔ اب اگر اس نے معیارِ انسانی کو پست کر ہی دیا ہے تو تم انسانیت کو بدنام نہ کرو۔ تم ردِ سوال نہ کرو۔ ایک طرف اسکو روکتا ہے "خبردار! مانگنا نہیں"۔ دوسری طرف آپ کو حکم دیتا ہے کہ "خبردار! سوال رد نہ کرنا! اما السائل فلا تنھر" سوال کرنے والے کو رد نہ کرو، اس کو جھڑکو نہیں"۔ کسی موقع پہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے نہ دینے سے اور سوال کو پورا نہ کرنے سے عادت گدائی کی چھوٹے گی تو اس وقت آپ کو سوال کا رد کرنا مستحسن ہوگا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ردِ سوال مستحسن نہیں ہے۔

عبادت کا صحیح مفہوم

تجارت اور کسبِ معیشت کی اہمیت

اسلام نے انسان کو عبادت کا جو حکم دیا ہے اس کے متعلق غلط فہمی ہے بعض لوگوں کو عبادت کے معنی سمجھنے میں یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ عبادت صرف نماز و روزہ کا نام ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عبادت کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ عبادت کا مفہوم ہے فرائض کا ادا کرنا۔ عبادت کے معنی ہیں خدا کی رضا مندی حاصل کرنا اپنے اعمال کے ذریعہ سے اس میں تمام وہ شعبے زندگی کے داخل ہیں جن پر تمام انسانوں کو عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

انفرادی افعال میں، اجتماعی افعال میں، حق اللہ میں، حق الناس میں، ہر چیز میں انسان کا جو فرض ہے اس کو ادا کرنا یہ عبادت میں داخل ہے وہ چیز کہ جس کو بالکل ہی عبادت سے الگ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی مال و دولت کا حاصل کرنا وہ بھی حلال طریقہ سے ہو تو دین سے الگ نہیں ہے۔

"تجارت اور اسلام"[1] میں لکھ چکا ہوں کہ جناب رسالتمآب مسجد میں تشریف رکھتے تھے کہ ایک جوان خوش شکل و شمائل اُدھر سے ہو کر گزرا۔ اصحاب کرام نے یہ کہا۔ "افسوس اس کی جوانی پر، کاش یہ جوانی عبادتِ خدا میں صرف ہوتی"۔

جناب رسالتمآب نے سنا تو فرمایا۔ "کیا کہا تم نے؟"

انھوں نے کہا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ "یہ جوان اپنی جوانی کو گزار رہا ہے طلبِ دنیا میں، کاش احکام کے پورا کرنے اور عبادت میں گزارتا"۔

---

[1] یہ کتابچہ قبل ازیں امامیہ مشن پاکستان سے شائع ہو چکا ہے۔

آپؑ نے فرمایا۔ "یہ تم نے کیونکر کہہ دیا کہ اس کی جوانی راہِ خدا میں صرف نہیں ہو رہی ہے۔ اگر اس کا مالِ دنیا طلب کرنا اس لیے ہے کہ اپنے اہل و عیال کے رزق کی کشائش کر سکے اور ان کے لیے سامانِ راحت مہیا کرے تو وہ خدا کی راہ میں ہے۔ عبادت میں مصروف ہے اگر اس لیے مال و دولت حاصل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے حج کرے صدقہ عطا کرے تب بھی وہ خدا کی راہ میں ہے۔

ہاں! بے شک! اگر مال و دولت کو صرف اس لیے حاصل کرتا ہے کہ اپنے ابنائے جنس میں تفوق حاصل کرے تب بے شک شیطان کے راستہ میں ہے تو انسان اگر مال و دولت حاصل کرنا چاہتا ہے اس لیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ امورِ خیر کا انصرام کر سکے تو کون کہتا ہے کہ وہ عبادت سے الگ ہے؟"

تجارت وہ چیز ہے جسے انبیاء و مرسلینؑ نے کیا لیکن ہماری تو یہ حالت ہے کہ ہم نے تجارت کو اپنے لیے سببِ حقارت کو ذلت سمجھ لیا ہے۔

ہماری یہ حالت ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص کبھی تجارت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ یہ اشتہار شائع کرتا ہے کہ "گردشِ زمانہ سے اب شیعوں کی یہ حالت پہنچی ہے کہ وہ تجارت کر رہے ہیں۔"

اس کے معنی یہ ہیں کہ تجارت عار و ننگ ہے، تجارت گداگری سے بھی بڑھ کر ہے "گردشِ زمانہ سے اب یہ حالت پہنچی ہے" یاد رکھیے کہ جس کام کو آپ ذلت سمجھ کر اختیار کریں گے دنیا حق رکھتی ہے کہ اس پہ آپ کو حقارت کی نظر سے دیکھے۔ اگر گردشِ زمانہ سے یہ وقت آیا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ گردشِ زمانہ سے ہماری زندگی کا دور آیا ہے۔ ہماری کامیابی کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ لکھنؤ میں شرفائے شہر نے تجارتیں کرنا شروع کیں تو اس کو ایک غیر معمولی صورت سے شروع کیا علماء کو بلا کر دکانوں کا افتتاح کرایا۔ اشتہار شائع کیا کہ شیعوں کو قومی حیثیت سے

تجارت کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم نے تجارت کا سلسلہ شروع کیا۔ فلاں شخص نے اپنے مواعظ میں چونکہ تجارت پر ترغیب دلائی تھی اس کے مواعظ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہم اس دکان کا افتتاح کر رہے ہیں۔

حالانکہ اس طرح تجارت نہیں ہوتی، آپ کیوں ڈرتے ہیں۔ کوئی کام شروع کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے مواعظ سے مجبور ہو کر میں اس کو شروع کرتا ہوں۔ آپ کیوں یہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں کہ ہم ضروریاتِ زندگی سے مجبور ہو کر تجارت کرتے ہیں، کیوں نہیں کہتے، کہ ہماری زندگی موقوف ہے تجارت پر اس لیے تجارت کرتے ہیں۔ آپ تاجر بننا چاہتے ہیں تو مصلح کی شکل کیوں اختیار کرتے ہیں۔ آپ تجارت کیجیے، دکانداروں کی شکل میں اس کو کوئی دوسرا لباس نہ پہنائیے، پھر بھی اچھا ہے، یوں ہی رفتہ رفتہ افرادِ قوم کی ذہنیت میں تبدیلی ہوگی۔ اگرچہ آگے بڑھنے والے بہت آگے بڑھ گئے لیکن ایک جگہ ٹھہرنے سے آگے بڑھنا پھر بھی بہتر ہے۔

اجتماعی زندگی کے مختلف پہلو

ایک گھر کے رہنے والوں کی زندگی، ایک شہر کے رہنے والوں کی، ایک ملک کے رہنے والوں کی اس کے بعد تمام دنیا کے رہنے والوں کی زندگی۔ اسلام نے کسی جزو کو حیات کے تشنۂ تعلیمات نہیں چھوڑا، ہر شعبہ میں حیات کے اپنے علمی و عملی نقش قائم کر دیے ہیں جس پر عمل کرنا صحیح طور پر کامیابی کا ذمہ دار ہے۔ تدبیر منزل اور سیاست مدن کے باب میں کیا کہنا اسلامی قانون کی جامعیت کا کہ علمائے علمِ اخلاق کو اس باب میں کہنا پڑتا ہے، کیا کریں شریعتِ اسلام نے ضروریات کو پورا کر دیا۔ ایک کتاب فقہ کی جو احکامِ اسلام کی جامع ہے وہی علمِ اخلاق کی جامع ہے۔ جتنے دنیا کے شعبے ہیں سب شریعتِ اسلام کے اندر مکمل طور سے موجود ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے۔ جس طرح ایک بادشاہ اپنی رعایا سے نسبت رکھتا ہے ہر شخص کو اپنے گھر کے افراد سے وہی نسبت حاصل ہے کوئی شخص اپنے کو ذمہ داری سے سبکدوش نہ سمجھے۔ کلکم راع و کلکم مسئول۔ ہر شخص تم میں سے نگران ہے اور ہر شخص تم میں سے جواب دہ ہے۔ باپ کے مقابلہ میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ باپ کو اولاد کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ زوجہ کو شوہر اور شوہر کو زوجہ کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ ہر بات کو شریعتِ اسلام نے اس طرح سے پیش کیا کہ اس سے بہتر تعلیم ہو نہیں سکتی۔ تمام نظامِ عالم آپس کے سلسلۂ احتیاج پر قائم ہے۔ اگر سلسلۂ احتیاج یک طرفہ ہو تو نظامِ عالم معطل ہو جائے، قدرت نے نظامِ دنیا کو اس طرح قائم کیا ہے کہ ہر شخص محتاج ہے۔ اور ہر شخص محتاج الیہ ہے۔ جب اس طرح سے تمام کڑیاں آپس میں جڑیں گی اس وقت نظامِ عالم برقرار رہے گا

اس لیے تقسیمِ عمل کا اصول نافذ کیا گیا کہ تقسیمِ عمل کے ذریعہ سے ہر شخص دوسرے کا محتاج الیہ بن جائے۔

اسی سے یہ کثرتِ وحدت کا لباس پہنتی ہے۔ کوئی مرکب اس وقت تک عالم ترکیب میں رہ نہیں سکتا۔ جب تک کہ اس کے اجزا ایک دوسرے کی طرف احتیاج نہ رکھتے ہوں دنیا کا انتظام، ملک کا انتظام اسی طرح گھر کا انتظام اگر تمام عنصر جو گھر میں قدرت نے ودیعت کیے ہیں یہ عناصر ایک دوسرے کی طرف محتاج نہ ہوں تو یہ نظام درست نہیں ہو سکتا۔ اس لیے قدرت نے ان کے درمیان تقسیمِ عمل کیا۔ چونکہ وہ شریعت بیکار ہے جو فطرت کے مطابق نہ ہو اس لیے انسان کی فطرت کو دیکھا کہ باہر کے لیے کون مناسب ہو سکتا ہے اور اندر کے کون لائق۔ تقسیمِ عمل کے اصول پر نظام قائم کیا۔ اور فرائض کو دو شعبوں میں تقسیم کیا۔ امورِ داخلی اور امورِ خارجی، امورِ داخلی کا انتظام گھر کی ملکہ کے سپرد کیا اور امورِ خارجی کا انصرام مرد کے حوالہ۔

کون کہتا ہے کہ اسلام نے عورت کا معیار پست مقرر کیا۔ کون کہتا ہے کہ اسلام نے عورت کو ذلّت کی نظر سے دیکھا۔ اسلام نے مرد کو کارکن قرار دیا۔ عورت کو ملکہ بنایا، مرد کو مزدور اور عورت کو سرمایہ دار قرار دیا۔ مرد کو حوادثِ دنیا کے تھپیڑوں میں ڈال دیا۔ مرد کے قوائے عمل کا اندازہ کیا، اس نے اس کی بنیاد جسمانی کو پہلے سے اس کے مطابق قرار دیا تھا کہ دنیا کے بیرونی مشکلات کا مقابلہ کرے۔ یہ سب کچھ مرد کے لیے چھوڑا۔ اور وہ باریک کام گھر کا جس میں قوتِ شعور و خیال کی ضرورت ہے اس کو عورت کے سپرد کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عورت گھر میں بیٹھی ہوئی کام کرتی رہے، مرد باہر کام کرتا رہے وہ جو کچھ حاصل کرے لاکر اس کے پاس ڈال دے۔ اس مال و دولت کو یہ صرف کرے اور اس کا انتظام درست رکھے۔ اس طرح اس نے انتظام قائم کیا گھر کا۔ اس طرح خانہ داری کے اصول کی تعلیم دی۔ آج آپ جائیے۔ دنیائے متمدن میں دیکھیے، سب کچھ ہے۔ کونسلوں میں عورتیں

پہنچ گئی ہیں۔ اداروں میں اور دفتروں میں موجود ہیں، لیکن انتظام خانہ داری درست نہیں ہے لوگوں نے گھر کو بگاڑ کر جنگل کو آباد کیا، خود برباد ہوئے، دوسروں کی خانہ آبادی کر دی۔ لیکن اسلام نے آپ کے سامنے کیا قانون پیش کیا تھا۔ ادھر مرد کی فوقیت عورت پر ثابت کی۔ کہ اگر ہم نے اسے کارکن قرار دیا ہے تو مزدور ہی نہ سمجھ لینا۔ الرجال قوامون علی النساء "مرد صاحبِ اختیار قرار دیا گیا ہے عورت پر"

اس طرح اس کے معیار کو بلند کیا۔ عورت کے معیار کو لطف و مرحمت کے پہلو کو آگے بڑھا کر بلند کیا، فرماتے ہیں۔

المرأۃ ریحانۃ۔ "عورت گلدستہ ہے، عورت گلاب کا پھول ہے"۔ پھر گلاب کے پھول کو جتنے ملائم ہاتھوں سے رکھ سکتے ہو۔ اس طرح اسے رکھو۔

گھر میں ماں اور بیٹا ہے، بیٹے کے لیے ماں کی اطاعت اسی طرح قرار دی جس طرح باپ کی اطاعت ہے۔ کہا کہ جنت ماں کے پیروں کے نیچے ہے۔ یہاں تک معیار بلند کیا گیا کہ اگر کسی حکمِ الٰہی سے جو بحد وجوب نہ ہو تصادم ہو جائے والدین کے حکم کا تو وہ امر مستحب حرمت کا لباس پہن لے گا۔ یعنی بہتر سے بہتر عملِ صالح مثلاً مستحبی نماز، حج مستحب یا زیارت کو ماں نے منع کر دیا۔ بس اب ناجائز اور حرام ہے۔ لاتقل لھما اف ولاتنھرھما "باپ، ماں کے لیے اُف بھی نہ کہو اور ان سے جھڑک کر بات نہ کرو"۔ اس طرح دونوں کے معیار کو ایک رکھا گیا۔

بے شک جب خدا کے حکم کے مقابلہ میں والدین آئیں اس وقت کے لیے ارشاد ہوا وان جاھداک علی ان تشرک بی باللہ مالیس لک بہ علم فلا تطعھما "اگر یہ لوگ تم سے اس بات کے طالب ہوں کہ تم خدا کے ساتھ شرک کرو۔ تو پھر ان کی اطاعت نہ کرنا"

اولاد جب تک صغیر السن ہے اس کے حقوق والدین پر قرار دیے گئے۔ لیکن

جب بچہ سنِ تمیز کو پہنچ گیا اور بیٹا اس کے قابل ہوا کہ وہ کسب معیشت کر سکے اب باپ پر اس کی ذمہ داری نہیں رہی۔ بے شک باپ پر جو ذمہ داری تھی وہ تربیت کی تھی لیکن جب وہ تربیت کر چکا تو اب بیٹے کا کوئی فرض باپ پر نہیں رہا۔ لڑکی بے شک جس وقت تک اس کی شادی نہ ہو اس وقت تک اس کا فرض باپ کے ذمہ ہے۔ لیکن جب شادی کر دی تو اب وہ دوسرے گھر کے انتظام سے متعلق ہو گئی۔ اب اس کا رابطہ اس پہلے گھر سے منقطع ہو گیا۔ اب اس کے کچھ حقوق نہیں۔ ہاں باپ کی میراث میں لڑکیوں کا بھی حصہ ہے لیکن افسوس کہ پنجاب وغیرہ میں اور یو۔ پی کے بھی دیہاتوں میں مسلمانوں نے مثل ہندوؤں کے لڑکی کا حصہ ہی میراث میں ختم کر دیا ہے۔ یہ بالکل شریعتِ اسلام کے خلاف ہے۔
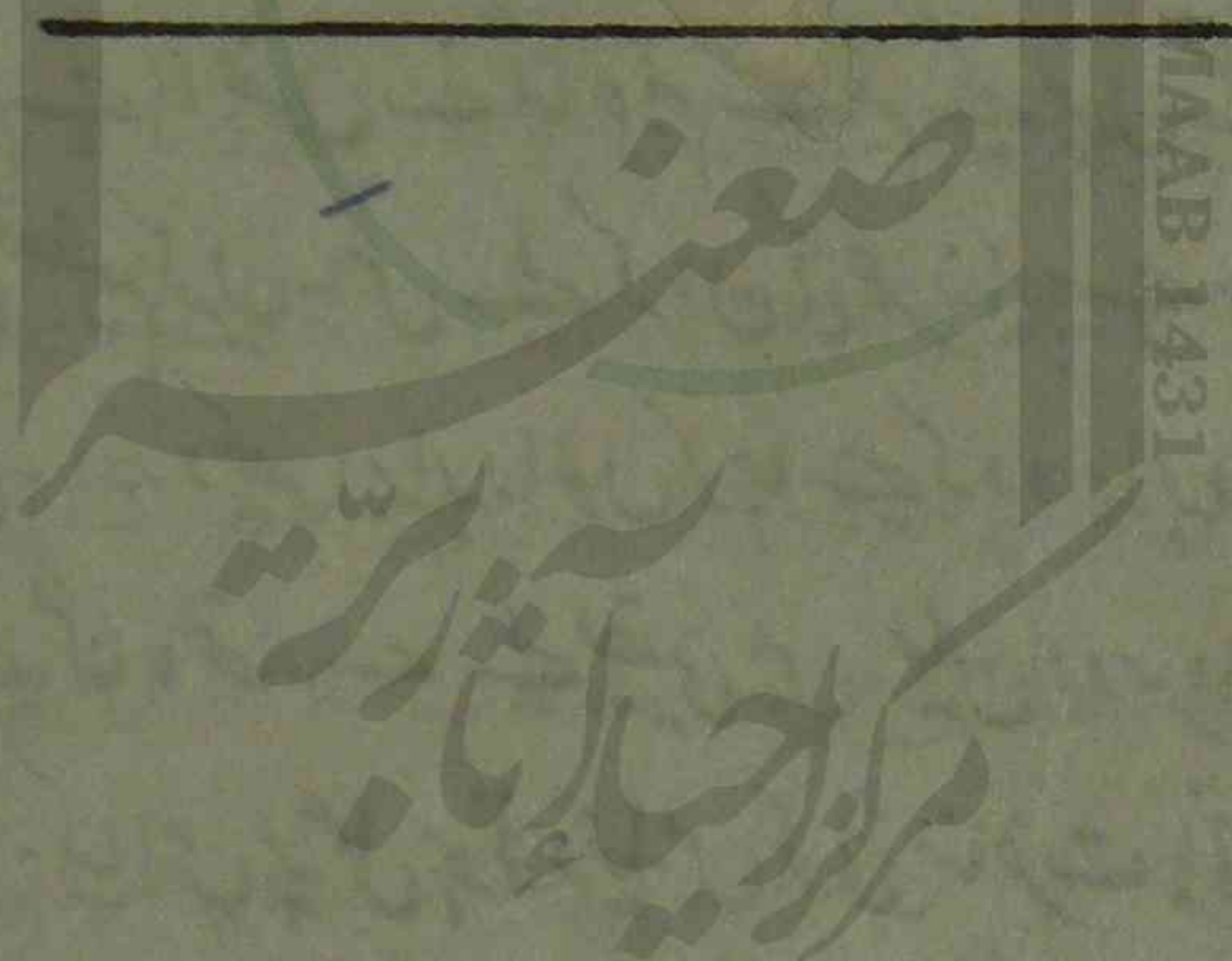
نظام اجتماعی یعنی عام سیاستِ تمدّنی

اسلام نے دنیا کے لیے یہ نظام قرار دیا کہ ہر شخص دوسرے کا احترام کرے۔ درحقیقت آپس میں فسادات ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ ایک دوسرے کو اپنے سے کم سمجھتا ہے اسلام کا یہ قانون ہے کہ کسی شخص کو حق نہیں ہے کہ اپنے کو دوسرے سے بہتر سمجھے۔

لا یسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیرا منھم ولا نساء من نساء عسیٰ ان یکن خیرا منھن۔ ہرگز ایک قوم دوسری کا تمسخر نہ کرے۔ ممکن ہے کہ وہ تم سے اچھے ہوں۔" اور نہ کوئی عورت دوسری عورت کا تمسخر کرے ممکن ہے کہ اس کا مرتبہ بلند ہو"

حدیث میں ارشاد کیا گیا، دیکھو! بڑوں کو چاہیئے کہ چھوٹوں کی عزت کریں۔ کیوں؟ اس لیے کہ عمر ان کی کم ہے، انھوں نے گناہ تم سے کم کیے ہوں گے، اور چھوٹوں کو چاہیے کہ وہ بڑوں کی تعظیم کریں۔ اس لیے کہ ان کی عمر زیادہ ہے۔ انھوں نے طاعت تم سے زیادہ کی ہوگی۔ اور دیکھو! برابر والوں کو چاہیے کہ وہ برابر والوں کی عزت کریں اس لیے کہ تمھارے گناہ تمھارے لیے یقینی ہیں۔ لیکن دوسروں کے گناہ تمھارے لیے یقینی نہیں ہیں۔ کیا اس پر عمل ہو تو دنیا میں کوئی منافرت باقی رہ سکتی ہے؟

اسلام ہی وہ ایک واحد مذہب ہے جس میں شاہ وگدا مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ مذہبی حیثیت سے ایک بادشاہ کو اپنے ایک معمولی سپاہی پر کوئی تفوق حاصل نہیں ہے۔ اس میں اگر تفوّق بھی قرار دیا گیا ہے تو روحانی اعتبار سے قرار دیا گیا ہے۔

نمازِ جماعت میں یہ حکم ضرور قرار دیا گیا ہے کہ امام کے بعد پہلی صف میں صاحبانِ تقویٰ، وہ نیک اعمال والے لوگ ہوں گے جن میں ہر ایک حق رکھتا ہو امامِ جماعت ہونے کا۔ ہمارے یہاں تنظیم نہیں ہے اس لیے نمازِ جماعت کی ترتیب

بھی درست نہیں ہے۔ امام کے بعد پہلی صف میں اس سے متصل ایسے افراد ہونا چاہئیں جن میں سے ہر ایک نماز جماعت پڑھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ تاکہ اگر امام کسی وجہ سے قاصر ہو جائے نماز کے پورا کرنے سے تو ان میں سے ایک شخص آگے بڑھ کر مصلے پہ پہنچ کر نماز کو تمام کرے لیکن اس کے علاوہ اور کوئی تفوق قرار نہیں دیا گیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ مالدار پہلی صف میں ہوں فقیر دوسری صف میں، معززین آگے ہوں گمنام افراد پیچھے۔

ایسا کوئی تفوق نہیں ہے۔ سب مساوی ہیں۔ ایک فقیر پہلی صف میں ہو اور ایک امیر دوسری صف میں ہو تو اس امیر کا سر اس فقیر کے پیروں کے پاس ہوگا یہ خصوصیت بھی اسلام سے مخصوص ہے وہ جنھوں نے دائرۂ اسلام میں قدم رکھا خواہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں۔ جب دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے تو ان کے حقوق مساوی ہو گئے۔ ان تمام افراد کے ساتھ جو پہلے سے اسلام میں تھے کوئی تفریق نہیں ہے۔ پست سے پست افراد جن کو لوگ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اگر مسلمان ہو جائیں تو ان کے حقوق مساوی ہیں۔ یہ بھی دوسروں کو دیکھ کر ہم نے تقلید کی ہے کہ بہت سے وہ نیچ ذات کے لوگ مثلاً مہتر اگر مسلمان ہو جاتے ہیں تو بہت سے افراد اہلِ اسلام ان کے پاس بیٹھنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ یہ اسلام کی تعلیم کے بالکل مخالف ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو ہم نے دوسروں کو دیکھ کر اختیار کر لیا ہے۔ اب اگر آپ دولِ اسلامیہ میں جہاں خود اصل اسلام کی باقی ہے، جہاں دوسروں کی ہمسائگی نے ہمارے اخلاق کو تبدیل نہیں کیا ہے جا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہاں بالوعہ صاف کرنے والے لوگ دن میں بالوعہ صاف کرتے ہیں اور سر سے پاؤں تک نجاستوں میں لت پت ہوتے ہیں لیکن ادھر غسل کیا صاف کپڑے پہنے اور جا کر نماز جماعت میں شریک ہو گئے چاہے پہلی صف ہو، یا آخر

صف ہو۔ ان کو کوئی منع کرنے والا نہیں ہے کہ تم آکر علماء کے ساتھ کیوں بیٹھے۔ اُن کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ تم ہمارے قریب نہ بیٹھنا۔ بالکل مساوات، کوئی تفریق نہیں یہ ہے اسلام کی تعلیم۔ یہ ہے اسلام کی ہدایت، وہ بھی درحقیقت ایک رکن ہیں اس نظام حیات کے جس پر دنیا قائم ہے، درحقیقت آپ ان کے بھی دستِ نگر ہیں۔ اگر ان لوگوں کا وجود نہ ہو تو آپ کی حیات قائم نہیں رہ سکتی۔ تمام افرادِ انسان مثل اعضائے بشری کے ہیں۔ ان اعضاء میں جس طرح سے قدرت نے تقسیم عمل کی ہے۔ ہاتھ ہیں، پیر ہیں آنکھیں ہیں۔ ہر ایک کے فرائض الگ الگ ہیں۔ ہر ایک کی منزل الگ الگ ہے نظام زندگی کے اعتبار سے ہر ایک کا کام اس کے ذمہ ہے دوسرا اس میں مزاحمت نہیں کرتا۔ کوئی ایک عضو انسان کا دوسرے کو ذلیل نظر سے دیکھنے کا حقدار نہیں ہے پاؤں میں لگا ہوا کانٹا ہاتھ ہی سے نکلے گا۔ ہاتھ بلند ضرور ہے لیکن ضرورت پڑے گی تو ہاتھ کا کام پاؤں سے اور پاؤں کا کام ہاتھ سے نکلے گا۔ شیرازہ اجتماعی یوں ہی منظم ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ تمام شعبے جو انسانی زندگی کے ہیں اس کی تقسیم ضرور ہے۔ کسی سے کوئی کام متعلق ہے اور کسی سے کوئی کام۔ لیکن کسی کو اس کے پیشہ کی وجہ سے ذلیل نظر سے نہ دیکھیے۔ جس طرح بہت سی باتوں میں وہ آپ کے دست نگر ہیں اسی طرح بہت سے کاموں میں آپ ان کے دست نگر ہیں تو آپ کو کیا حق ہے اس کا کہ ان کو نگاہِ ذلت سے دیکھیے۔ اصحاب ائمہ کیسے کیسے افراد تھے۔ یہ اصحاب ائمہ کوئی معمولی ہستیاں نہیں ہیں، وہ وہ ہیں کہ احکام شرعیہ انہی کے ذریعہ سے ہم کو پہنچے ہیں۔ ان میں سے کسی کے نام کے ساتھ کتب رجال میں ملے گا۔ "جمال" اونٹ چلانے والا" کسی کے نام کے ساتھ ملیگا۔ "تمار" کسی کے نام کے ساتھ "بزاز"۔ کسی کے نام کے ساتھ ملیگا "دہان" جس کو آپ اپنے پست الفاظ میں "تیلی" کہتے ہیں۔ کسی کے نام کے ساتھ ملے گا "طحان"

"آٹا بیچنے والا"۔ کسی کے نام کے ساتھ ملے گا "بقال"۔ یعنی سبزی بیچنے والا۔ اس طرح مختلف افراد کے ساتھ مختلف اوصاف ملیں گے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب لوگ دن بھر دکان پر بیٹھتے تھے کسبِ معیشت کرتے تھے۔ جس وقت فرصت ہوتی تھی جا کر علوم ائمہ کو حاصل کرتے تھے۔ یہی افراد ہیں جن کی عملی سیرت ہمارے لیے قابلِ قدر ہے۔ قابلِ پیروی ہے ائمہ نے ان کو احکام تفویض کیے۔ اگر کسی نے تجارت کو چھوڑ دیا، پوچھا کیوں چھوڑ دیا۔ ضرور تجارت شروع کرو۔

اس لیے کہ باز رہنا تجارت سے اور ترک کرنا عمل شیطان سے ہے۔ پھر یہ کہ کوئی اپنے کو دوسرے کے مقابلہ میں بڑا متقی اور پرہیز گار نہ سمجھے بے شک یہ درست ہے کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم تم میں سب سے زیادہ معزز ہے۔ جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیز گار ہو۔ لیکن یہ تو اللہ کی نظر سے وابستہ ہے کہ جو اتقیٰ ہوگا وہ معزز ہوگا۔ اس لیے کہ باطن کا علم خدا کو ہے۔

کوئی اس بات پر نہ جائے کہ میں نے بہت نمازیں پڑھی ہیں روزے رکھے ہیں لہٰذا دوسروں سے میں بہتر ہوں۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر شخص مجھ سے بہتر ہے۔ اگر ایسا جذبہ پیدا ہو جائے تو گھمنڈ اور غرور کا وجود دنیا میں نہ رہ جائے۔ لا یسخر قوم من قوم کوئی جماعت دوسری جماعت کا تمسخر نہ کرے۔ مذاق اور چیز ہے، تمسخر اور چیز ہے، فرق یہ ہے کہ مذاق میں کسی کی اہانت منظور نہیں ہوتی۔ تمسخر میں اہانت شریک ہوتی ہے۔ مذاق حدِ جائز میں ہو تو مزاح میں داخل ہے۔ مزاح المومنین خیر۔ لیکن وہاں تک کہ حدِ اعتدال میں رہے تمسخر وہ ہے جس کے لیے ارشاد ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کسی دوسرے کا تمسخر نہ کرے، اسے کیا معلوم، شاید یہ اس سے بہتر ہو۔

ولا نساء من نساء عسیٰ ان یکن خیرا منھن اور نہ عورتوں کو حق ہے کہ وہ دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، کیا معلوم وہ بہتر ہوں ان سے عمل میں ولا

تنابزوا بالالقاب اور مختلف القاب نہ رکھو۔ پکارنے کے لیے، جیسے اکثر دوسروں پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ نام ایسے رکھتے ہیں جو برے معلوم ہونے کے قابل ہوں۔ ایسا نہ کرو۔ یہ کیا ہے کہ ہمارے کسی مزعومہ معیار عظمت میں کمی ہوئی۔ اور ہماری تیوریوں پر بل آگئے۔ چاہے دوسروں کے حق میں ہم نے کتنی ہی فروگذاشت کی ہو مگر ہماری تعظیم کے لیے اگر کوئی نصف قد سے کم کھڑا ہو تو برا معلوم ہوگا۔ مگر خود ہم نے اپنے طرز عمل کا جائزہ کبھی نہیں لیا کہ ہم تو کبھی کسی کے ساتھ کمی نہیں کرتے؛

امیرالمومنینؑ نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔ اجعل نفسک میزانا فیما بینک وبین غیرک۔ اپنے اور اپنے غیر کے درمیان، اپنے نفس کو ترازو بناؤ۔

فاحبب لغیرک ما تحب لنفسک غیر کے لیے اسی بات کو محبوب سمجھو جس کو اپنے نفس کے لیے محبوب سمجھتے ہو۔

واکرہ لہ ما تکرہ لھا۔ اور ناگوار سمجھو غیر کے لیے جس کو اپنے لیے ناگوار سمجھتے ہو۔ ولا تظلم کما لا تحب ان تظلم دوسروں پر ظلم نہ کرو جس طرح یہ نہیں چاہتے ہو کہ کوئی تم پر ظلم کرے۔ واحسن کما تحب ان یحسن الیک دوسروں کے ساتھ اچھائی کرو جس طرح چاہتے ہو کہ لوگ تمھارے ساتھ اچھائی کریں۔ واستقبح من نفسک ما تستقبح من غیرک۔ جس چیز کو غیر کے لیے معیوب سمجھتے ہو اسے اپنے لیے بھی معیوب خیال کرو۔ وارض من الناس بما ترضاہ لھم من نفسک۔ دوسروں سے اپنے لیے اتنے ہی طرز عمل پر راضی ہو جاؤ۔ جتنے طرز عمل پر تم غیر کے ساتھ اپنی طرف سے راضی ہوتے ہو یعنی تم خود جتنا برتاؤ غیر کے ساتھ کر سکتے ہو اور کافی سمجھتے ہو اتنے ہی کو کافی سمجھو غیر کی طرف سے اپنے لیے یہ تعلیم ہمارے سامنے موجود ہے مگر ہم کو کبھی توجہ نہیں ہوتی کہ ہم اپنے اعمال و افعال کو پرکھیں کہ کہاں تک وہ معیار صحیح پر ہیں۔ ہماری نظر دوسروں کے افعال پر بہت جلد پڑتی ہے۔ کبھی ہمیں اس

امر پر غور کرنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ کہیں ہمارے طرز عمل میں تو وہ قابل اعتراض چیز نہیں پائی جاتی۔ اگر انسان اپنے نفس پر توجہ کرے تو اس کی نظر غیر پر جائے ہی کیوں۔ اسے اپنے ہی سے فرصت نہ ملے۔

مومن کے لیے ارشاد فرماتے ہیں نفسہ منہ فی عناء والناس منہ فی راحۃ دنیا اس کی طرف سے چین اور آرام میں ہے مگر اس کا نفس خود ایک شکنجہ میں مبتلا ہے زانوا انفسکم قبل ان توزنوا "تولو اپنے نفس کو قبل اس کے کہ تولنے کا وقت آئے۔" لیکن ہمارا تو یہ کام ہے کہ ہم کسی جگہ بیٹھیں تو یہ نقل محفل ہے کہ دوسروں پر اعتراض کریں۔ دوسروں کی اچھائیوں سے چشم پوشی کرنا اور دوسروں کی برائیوں کو نمایاں کرنا۔ یہ چیزیں وہ ہیں جن سے ہیئت اجتماعی میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ اسلام نے اس کو منع کیا۔ لا یغتب بعضکم بعضا ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتا فکرھتموہ "کبھی تم میں سے کوئی دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی کرنے کی جرأت نہ کرے کیا تم اسکو پسند کرتے ہو کہ تم اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاؤ۔" جیسے کوئی مردہ ہو اس کو خبر نہیں اگر اس کا گوشت کوئی کھائے۔ ویسے ہی کسی کی غیبت میں برائی کرنا۔ ایک دوسرے کی دل آزاری کرنا، ایک دوسرے کا دل دکھانا اس کو بڑی معصیت قرار دیا۔ ان الذین یؤذون المومنین والمومنات بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتانا واثما مبینا۔ وہ لوگ جو ایک دوسرے کو اذیت دیتے ہیں ناحق انھوں نے بڑی معصیت کا ارتکاب کیا۔ خدا کی طرف سے اسکو "اثم مبین" یعنی "کھلا ہوا گناہ" کہا جا رہا ہے۔ کہا "مومن کا دل بماری جائے نزول اجلال ہے۔ اگر مومن کے دل کو تکلیف پہنچی تو اس سے مجھ کو تکلیف ہوگی۔ مومن کے دل کو اپنی فرودگاہ بتایا۔

فرمایا لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المومن ارض وسما میں میرے لیے وسعت نہیں ہے۔ مگر مومن کے دل میں میرے لیے

وسعت ہے۔"

امیرالمومنینؑ ارشاد فرماتے ہیں تلافیک ما فرط من صمتک البسیر من ادراکک مافات من منطقک" خاموش رہنے میں اگر کوئی مقصد فوت ہوتا تو اس کا تدارک آسان ہے۔ اس خرابی کے تدارک سے جو بات کہہ ڈالنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔"

یہ زبان، اگر اس کو کسی ایسے کلمہ سے جو کسی دوسرے کے دل میں ٹھیس لگنے کا باعث ہو، انسان روکے رہے تو کیا ہے کو دنیا میں منافرت پیدا ہو۔ ایک طرف یہ ممانعت کہ خبردار تمھاری طرف سے کسی کا دل نہ دکھنے پائے، کسی کو ایذا نہ پہنچے پائے ایک طرف یہ حکم کہ کسی کی حاجت کو پورا کر دینا ستر برس کی عبادت کے برابر ہے آپس میں ایک دوسرے کی خدمت کرنا یہ وہ چیز ہے جو بہتر سے بہتر عبادت قرار دی گئی ہے۔

امامؑ طواف میں مصروف تھے۔ ایک شخص آتا ہے اور کچھ عرض کرتا ہے۔ آپ طواف کو قطع کر کے اس کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ واپس آنے پر طواف کو پورا کرتے ہیں۔

ایک دوسرا شخص پوچھتا ہے کہ آپ نے طواف تمام نہیں فرمایا۔ فرماتے ہیں "ایک بندہ مومن کی ایک حاجت تھی مجھ کو اچھا معلوم ہوا کہ طواف سے قبل اس کی حاجت پوری کر دوں۔"

مگر ہم کو تو اس سے مطلب ہے کہ ہمارے لیے راحت و آرام ہو۔ دوسرے چاہے مشقت میں بسر کریں، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام افراد بمنزلہ فرد واحد کے ہیں انسان کے تمام اعضاء و جوارح رعایا ہیں، دل متمکن کیا گیا ہے عرش حکومت پر اس جسم کی مختصر مملکت میں، تمام اعضاء و جوارح اس کے لیے تابع فرمان ہیں۔ ذرا

نگاہ ڈالیے اعضاء کے باہمی ارتباط پر۔ ایک کانٹا اگر کسی پاؤں کے انگوٹھے میں لگتا ہے تو تمام اعضاء بے چین ہو جاتے ہیں۔

یہی پھر کیوں نہیں ہوتا کہ اگر ایک پر کوئی مصیبت پڑے تو دوسرے افراد بشر پر اثر ہو۔ اسلام نے یہی تعلیم دی کہ دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھو۔ دوسرے کے درد کو اپنا درد سمجھو۔ اپنی حاجت کو روک دو۔ دوسرے کی حاجت کو پورا کرو۔ یُؤثِرُونَ عَلیٰ اَنفُسِھِم وَلَو کَانَ بِھِم خَصَاصَۃ "مقدم کرتے ہیں دوسروں کو اپنے نفس پر۔ اگرچہ خود اپنے کو ضرورت ہو"

یہ ایثار یعنی دوسروں کو اپنے اوپر مقدم کرنا۔ یہی وہ خالص چیز ہے جو اسلامی تعلیم کا جوہر ہے۔ جب نقش اسلام تازہ تھا، گرد و غبار نہیں آنے پایا تھا۔ مسلمانوں کے طرزِ عمل میں اس تعلیم کے نمونے پائے جاتے ہیں جو رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی طرف سے ملی تھی۔ جنگِ یرموک کا واقعہ تاریخوں میں درج ہے، مسلمانوں کے لشکر میں کوئی آدمی زخمی ہو کر گرا ہے۔ پیاس کا غلبہ ہے۔ ایک شخص کسی اپنے عزیز کے لیے پانی لے کر پلانے جاتا ہے۔ ایک دوسرا زخمی پانی کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ وہ پہلا کہتا ہے کہ پہلے اسے پانی پلاؤ۔ یہ اس کی طرف پانی لے کر جاتا ہے تو تیسرا زخمی نظر آجاتا ہے۔ اس کی نظر بھی اسی جامِ آب پر ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ پہلے اس کو پانی پلا دو۔ اسی طرح چار آدمی پڑے ہوئے ملتے ہیں۔ جب چوتھے کے پاس پہنچتا ہے تو اس کی روح مفارقت کر جاتی ہے۔ تیسرے کے پاس آتا ہے وہ بھی اپنی جان دے چکتا ہے، دوسرے کے پاس آیا اس کا بھی جسم سرد ہو چکا تھا اور اسی طرح پہلا شخص بھی تشنہ لب دنیا سے رخصت ہو گیا۔

یہ مسلمانوں کا وہ طرزِ عمل ہے جو تازہ تازہ ان میں موجود تھا جس پر ابھی مادیت کا گرد و غبار نہیں پڑا تھا جس پر امتدادِ زمانہ نے غفلت کے پردے نہیں ڈال دیئے تھے

اب ہم میں سے کتنے افراد ہوں گے جو اس طرزِ عمل کے پابند ہوسکیں گے۔ ہمارے یہاں تو یہ ہے کہ کسی ایسے سخت موقع کا ذکر نہیں بلکہ جب کوئی ضیق نہ ہو، کوئی شدت نہ ہو ہم چاہتے ہیں کہ چاہے دوسرے کا گلا کٹ جائے مگر ہم منافع حاصل کرلیں۔ بلکہ ہم میں بہت سے ایسے افراد ہیں کہ اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہو دوسرے کو تو چاہے ہمیں وہ نہ ملتا ہو مگر ہم دراندازی کریں گے کہ اس کو یہ فائدہ نہ پہنچنے پائے۔ اگر ہمارے اسلام کی یہ حالت ہے تو ہم جس حد تک تنزل کریں تھوڑا ہے۔ ہمارے درمیان وہ اخوت باقی نہ رہی جس کو اسلام نے روحِ حیات قرار دیا تھا۔ انما المومنون اخوۃ۔ جس پر اپنا احسان جتایا تھا۔ کنتم اعداء فالّف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔ "تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اوس، خزرج کے خون کے پیاسے تھے۔ خزرج اوس کے گلے پر تلوار چلانے پر تیار تھے۔ اسلام نے ان اختلافات کو مٹا کر ایک نقطۂ اخوت پر مجتمع کیا۔ لیکن ہم؟ ہماری حالت تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور ایک دوسرے کو پامال کرنے کے لیے تیار ہے۔ ہم زبان سے مسلمان ہیں مگر اسلام کے نقش کو محو کر رہے ہیں ہم کہتے ہیں کہ ہم ترقی نہیں کرتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام مانع ترقی ہے۔ مگر ہمارے طرزِ عمل کا قصور ہے کہ اسلام کو مانع ترقی ثابت کریں۔ اگر اسلام اپنی حالت پر قائم رہتا تو ترقی ہمارے دم قدم سے وابستہ رہتی۔ ہمارے سامنے بہتر سے بہتر تعلیمات موجود ہیں۔ ہمارے سامنے رسولؐ کے اسوۂ حسنہ ہیں۔ اہل بیت طاہرینؑ کی سیرتیں ہیں، کربلا کا عظیم الشان تاریخی واقعہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ جس نے ہر قسم کے تعلیمات ہمارے سامنے پیش کیے۔ مثلاً مواخات کا سبق اور ایثار کا سبق اور کیا کیا بیش قیمت تعلیمات مگر آج ہم منافع میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں۔ مجالس کے حصول میں آپ دیکھ لیجیے۔ ایک دوسرے پر سبقت کرنا چاہتا ہے چاہے دوسرے کو تکلیف ہی پہنچ جائے۔ لیکن ہم ہی پہلے نکل جائیں اور مجلس کا حصہ حاصل کرلیں۔

لیکن اگر خطرہ کا وقت ہو تو ہر ایک پیچھے ہٹنا چاہے گا۔ دیکھ لیجیے۔ آج مجالس میں جو سب سے پہلے حصہ لینا چاہتے ہیں۔ وہ مجلس کی نشست میں سب سے موخر ہوتے ہیں اس لیے کہ منبر کے قریب بیٹھنے میں گرمی معلوم ہوتی ہے۔ اور مجمع کی کشمکش ہوتی ہے یہاں ایک دوسرے پر سبقت نہ کرے گا کہ ہم ہی ذاکر کے سب سے زیادہ قریب ہوں اس میں ہر ایک قدم پیچھے ہٹائے گا۔ لیکن حصہ میں سبقت ضرور ہوگی۔

مگر کربلا کے واقعہ میں سلاح جنگ تھے، موت تھی اور اس میں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ کم از کم وقت کے لیے بھی ہم دوسرے کو محفوظ رکھ لیں اور اپنی جان دے دیں انجام سب ہی کے پیش نظر تھا۔ کون سمجھتا تھا کہ ہم چلے گئے تو دوسرے محفوظ رہ جائیں گے۔ لیکن یہ تھا کہ جب تک ہم ہیں دوسرا نہ تلف ہو، جتنی دیر کے لیے بھی ہو ہم دوسرے کو محفوظ کر لیں، خود اپنی جان دے دیں یہ صورت عمل ہمارے سامنے پیش کی گئی۔ لیکن ہم آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے۔

غلاموں کے ساتھ برتاؤ

غلامی کا رواج تو اسلام کے پہلے سے تھا۔ اسلام نے اسے یک لخت ختم کرنا تو مناسب نہیں سمجھا مگر اس کے امکانات کے دائرہ کو محدود بنایا اور غلامی کے خاتمہ کی صورتیں فراہم کیں۔ نیز غلاموں کو بھی وہ حقوق عطا کیے جو انسانی حیثیت سے ان کے شایانِ شان تھے۔

غلامی کا صحیح مفہوم جو اسلام نے پیش کیا۔ اگر دیکھنا ہے تو سیدہ کے گھر پر جانا چاہیئے اور فضہ سے دریافت کرنا چاہیئے تمہارے ساتھ تمہاری شاہزادی کا کیا برتاؤ ہے؟ اس گھر کی کنیز یہ جواب دے گی کہ ایک دن گھر کا کام میں کرتی ہوں اور ایک دن ملکہ سخانہ کرتی ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ درحقیقت غلامی غلامی نہ تھی۔ وہ لوگ افرادِ خانہ میں داخل کر لیے جاتے تھے، کون نہیں جانتا کہ سلمان غلام تھے، وہ سلمان جن کے نام کی عظمت کے سامنے اس وقت ہمارے دل لرزتے ہیں۔ جن کے متعلق یہ ارشاد کیا گیا ہے کہ ایمان کے دس درجے ہیں۔ نو درجوں پہ سلمان فائز ہیں۔ علم اول کو بھی جانتے تھے۔ علمِ آخر کو بھی حاصل کیا تھا۔ جن کے متعلق اکثر معززین کو یہ احساس تھا کہ رسولؐ کی بارگاہ میں ان کی منزل ہم سے آگے ہے جن کے متعلق واقعات ہمارے سامنے تاریخوں میں پیشِ نظر ہیں کہ سلمان ایسے ایسے وقت میں رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچتے تھے کہ دوسرا نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ سلمان درحقیقت خرید کردہ تھے، رسول اللہؐ نے ان کو خرید کیا تھا۔ جو خرید کیا جائے وہ غلام نہ ہؤا تو اور کیا ہؤا۔ پھر آزاد کر دیا تھا۔ ان کی منزل وہ تھی کہ اہل بیتؑ میں داخل کر لیے گئے سلمان منا اھل البیت۔ امام جعفر صادقؑ کے سامنے کسی نے سلمان فارسی کہہ دیا۔ حضرت کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ کہا سلمان فارسی نہ کہو، سلمان محمدی کہو۔ بلال

غلام تھے اور حبشی غلام تھے۔ ان کو مؤذن کا عہدہ عطا کیا گیا تھا اور وہ دوسروں کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے۔ بعد وفاتِ رسولؐ انھوں نے مدینہ چھوڑ دیا تھا۔ کہ میں اس شہر میں اب نہ رہوں گا جس میں رسولؐ نہ ہوں۔ شام چلے گئے تھے۔ رسولؐ کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ "اے بلال تم اب ہماری قبر کی زیارت کو بھی نہیں آتے" بلال زیارت قبر رسولؐ کے لیے آئے۔ اس موقعہ پر ہے کہ حسنینؑ نے چچا کہہ کر خطاب کیا اور وہ خاص منظر تھا۔ جب بلال نے اذان دی ہے تو مدینہ میں انقلاب عظیم برپا تھا۔ یہ ایک غلام کی شخصیت ہوتی ہے۔

جناب سید الشہداؑ نے وقت رخصت جب تمام اہلِ حرم کو سلام کیا تو فضہ کو بھی سلام کیا تھا۔

جون غلام ابوذر غفاریؓ جب شہید ہوئے تو امام حسینؑ نے وہ برتاؤ کیا جو عزیز دل کے ساتھ بھی نہ کیا تھا۔ غلام کے رخسارے پر رخسارہ رکھ دیا اور دعائیں دیں۔

امام زین العابدینؑ کی کنیز کا واقعہ بھی مشہور ہے۔

حضرت تشریف فرما تھے۔ کنیز گرم شوربہ لے کر آئی، ہاتھ سے چھوٹ گیا اور حضرت کے پاؤں پر گرا۔ حضرت نے بس ایک نگاہ ڈالی مگر جرم کے احساس سے دل اس کا لرز رہا تھا۔ اس نے کہا (چونکہ افتاد طبع معصومین معلوم تھی) والکاظمین الغیظ غصہ کے روکنے والے۔ آپ نے فرمایا۔ کظمت غیظی۔ "اچھا میں نے روکا اپنے غصہ کو۔" والعافین عن الناس۔ اور عفو کرنے والے لوگوں کے۔ حضرت نے فرمایا۔ میں نے تجھے معاف کیا۔ اس نے کہا۔ واللہ یحب المحسنین۔ آپ نے فرمایا۔ "میں نے راہِ خدا میں آزاد کر دیا۔"

ایک شخص نے امامؑ سے عرض کیا کہ آپ کے غلام آپس میں تذکرہ کرتے ہیں کہ آپ کا کوئی رعب ان کے دلوں پر نہیں ہے تو آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ فرمایا۔ "میں خدا کا

شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کے بندے مجھ سے ڈرتے نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ غلام درحقیقت اپنے مالک کو بارِ خاطر نہ سمجھتے تھے یہ غلام درحقیقت فرزندوں کی طرح رہتے تھے۔ غلام کا نام بدنام ہے لیکن اچھائی اور برائی حقیقت سے تعلق رکھتی ہے تو اسلام کی غلامی دوسرے اقوام کی آزادی سے بہتر ہے۔ امیرالمومنینؑ اپنے غلام قنبر کو ساتھ لے کر تشریف لے گئے بازار میں۔ ایک کپڑا خرید کیا سات درم کا اور ایک ۵ درم کا۔ سات درم والا کپڑا قنبر کو دیا گیا۔ پانچ درم کا لباس خود زیب جسم کیا۔ قنبر نے عرض کیا۔ کہ یہ لباس آپ زیب جسم فرمائیے۔ آپ نے جواب دیا (جیسے بچوں کو جواب دیا جائے) قنبر تم نوعمر ہو تمہارے لیے یہی لباس بہتر ہے میں یہ لباس پہن لوں گا۔

جو لوگ حلقۂ معرفت الٰہی میں آجائیں اور اسلامی جامعہ میں مندرج ہو جائیں ان کے لیے غلامی کا سدِباب ہوجاتا ہے مسلمان کو غلام بنانے کا کسی کو حق نہیں۔ جو غلام ہوں ان کی آزادی پر بھی ایسے بیش قیمت ثواب کا اعلان کیا کہ اگر حقیقتاً کوئی پابندِ شریعت ہو تو اس اعلان پر یقیناً غلام کو آزاد کرنے پر متوجہ ہو جائے گا۔ جس نے ایک غلام کو آزاد کیا اس نے گویا ایک نفس کو زندہ کیا۔ جس نے ایک غلام کو آزاد کیا، اس نے گویا ستر برس خدا کی عبادت کی۔ خاص طریقوں سے غلاموں کی آزادی کا اعلان کیا۔ درحقیقت اسلام اس غلامی کا جو مساوات کے لیے عار و ننگ ہو حامی ہو کر نہیں آیا۔ اسلام آزادی کا علم اٹھا کر آیا تھا، اور خداوندِ عالم نے اسلامی قانون کے ذریعہ سے دنیا میں مساوات کی عمارت قائم کی کہ کسی شخص کو حق نہیں ہے کہ دوسرے کو حقارت کی نظر سے دیکھے۔

مُسلمانوں کی زندگی غیر اقوام کے ساتھ

وہ لائحہ عمل جو مسلمانوں کے لیے غیر اقوام کے ساتھ اختیار کرنے کے متعلق اسلام نے مقرر کیا ہے اور جس طرح رواداری کا ثبوت دیا ہے اس کا تذکرہ خود ایک طویل الذیل موضوع ہے جسے اس مختصر وقت میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا ہمیشہ کسی بات کے سمجھنے میں نقطۂ حقیقت تک نہیں پہنچا کرتی۔ اس لیے اکثر لوگوں نے یہ غلط خیال قائم کر لیا کہ اسلام دوسروں کے ساتھ دوستی کا حامی نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف غیر مسلم اسلام پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ اسلام امن و امان کا دشمن ہے اور دنیا میں فتنہ و فساد برپا کرنا اسلام کا کام ہے۔ دنیا کی خاموش فضا کو انقلاب سے تبدیل کرنا اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ دوسری طرف خود مسلمان اسلامی تعلیم سے بے خبر ہونے کی وجہ سے سخت سے سخت طرزِ عمل کو جو مذہب کے نام سے دوسروں کے مقابلہ میں اختیار کیا جائے اسلامی خدمت سمجھ کر کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے امن و امان کو حقیقتاً ٹھیس لگتی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ہم واقعی اسلام کے تعلیمات پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ درحقیقت اسلام نے غیر مسلمین کے ساتھ کیسے طرزِ عمل کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور اس نے خود کس حد تک رواداری سے کام لیا ہے۔

"اسوۂ حسینی" میں میں نے اسلام اور رواداری کے موضوع پر کافی تبصرہ کیا ہے اور جناب رسالتمآبؐ اور اہل بیتؑ کے اسوۂ حسنہ اور طرزِ عمل سے یہ دکھلایا ہے کہ اسلام کس طرح امن و امان کا حامی ہے۔ میں نے ثابت کیا ہے کہ اسلام شروع سے آخر تک صلح و آشتی کا پیغام ہے امن و امان کا علمبردار ہے اس نے خود اپنے لیے

نام "اسلام" کا اختیار کیا جو "سلم" سے مشتق ہے اور "سلم" کے معنی "صلح" کے ہیں
دوسری چیز جو اسلام کے ساتھ ساتھ طرۂ امتیاز قرار دی گئی وہ "ایمان" ہے اور ایمان
"امن" سے قرار دیا گیا جس کے معنی ہیں "اطمینان و عافیت" یعنی مسلمان وہ ہے جو
صلح پسند ہو اور مومن وہ ہے جو امن پسند ہو۔ صلح و آشتی اس کے نام کا جزء قرار دیا گیا
اس نے آپس کے برتاؤ میں آداب و قواعد قرار دیے جن سے حقیقت کا پتہ چلتا ہے، حکم ہے
کہ ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان سے جب ملاقات ہو تو کہے "سلام علیکم و رحمۃ اللہ"
اس طرح اپنی صلح پسندی کے جذبہ کا اظہار کرے اور یہ بات ہے کہ ہم تعلیمات
اسلام سے بے خبر ہو گئے اس رسم کو بھی ترک کر دیا۔ ہم میں وہ ظاہری رسم بھی باقی نہیں
رہی لیکن اسلام کے تعلیمات برابر اُن خاص خزانوں میں جو اُن کے امانتدار ہیں محفوظ ہیں
اور وہ ہمارے سامنے پیش نظر ہیں۔ اس شعبہ میں کہ اسلام نے دوسرے مذاہب کے ساتھ کیا
رویہ اختیار کیا ہے میری نظر سب سے پہلے اسلام کی ان تعلیمات پر پڑتی ہے جو دوسرے مذاہب کے بنیادی عقائد کے ساتھ
اسلام نے ظاہر کیے ہیں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام نے دنیا کے کسی مذہب کو جو درحقیقت مذہب کی حیثیت
رکھتا ہو۔ اصولی طور سے بنیاد کے اعتبار سے باطل نہیں کہا یہ پہلی رواداری ہے اسلام
کی غیر مسلموں کے ساتھ۔ یعنی ایک صورت یہ تھی کہ اسلام دنیا میں آ کر یہ اعلان کرتا کہ یہودیت
بے حقیقت چیز ہے۔ نصرانیت باطل ہے، دوسرے مذاہب جو ہیں ان کی کوئی حقیقت
نہیں ہے، تو یہیں سے بنائے مخاصمت قائم ہو جاتی۔ یہیں سے اسلام کے خلاف
دوسرے لوگوں کے دلوں میں جذبات عناد پیدا ہونے کا حق پیدا ہو جاتا۔ لیکن جب
ہم اسلامی تعلیمات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے کسی مذہب کو اس
کے اصل اصول اور بنیاد کے اعتبار سے باطل قرار نہیں دیا۔ یوں تو لغوی حیثیت سے
مذہب کے معنی ہیں چلنے کا راستہ۔ اس کے اعتبار سے تو لامذہبی تصور، دہریت
الحاد اور مادیت بھی مذہب ہے۔ لیکن جس اعتبار سے دنیا میں مذہب کی اصطلاح

قائم ہوئی ہے جس لحاظ سے مذہب و لامذہبیت کا مقابلہ کیا جاتا ہے اس اعتبار سے مادیت، دہریت اور الحاد کو مذہب کا حریف مقابل قرار دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے مذہب کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کسی خاص شریعت کا پابند ہو اور اس شریعت کو کسی سفیر الٰہی کے واسطہ سے خدا کی طرف منسوب کرتا ہو اس معنی سے یہودیت ایک مذہب ہے، نصرانیت ایک مذہب ہے، بدھ مذہب ایک مذہب ہے، وغیرہ وغیرہ۔

جب اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بت پرستی کوئی مذہب نہیں تھی مشرکین قریش جو بتوں کے سامنے اپنا سر نیاز جھکاتے تھے اور انھیں اپنا خدا سمجھتے تھے، اس کو انھوں نے کوئی شریعت و قانون نہیں قرار دیا تھا، بلکہ یہ ان کا ایک ذاتی خیال تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کی اس لحاظ سے پرستش کرتے ہیں کہ ہم کو خدا تک پہنچائیں، ان کے ذریعہ سے ہم اس کی بارگاہ میں قریب ہوں گے۔ یہ ایک طریق عمل ضرور تھا جو معین کر لیا تھا۔ لیکن اس کو اس معنی سے مذہب کہنا صحیح نہیں ہے، جس معنی سے عیسائیت اور یہودیت کو مذہب کہتے ہیں۔

اسلام نے بت پرستی کو باطل قرار دیا لیکن مذاہب عالم میں اسلام نے کسی کو اصول اور بنیاد کے اعتبار سے باطل نہیں کہا۔ اس لیے کہ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے ایک سفیر الٰہی کی وساطت سے، عیسائی اپنے کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں عیسیٰ کی وساطت سے۔ یہودی اپنے کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں موسیٰ کے واسطہ سے، ایران کے پارسی اپنے کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں زردشت کی وساطت سے اسی طرح ہندوستان کے مختلف مذاہب انسان رہنماؤں کی طرف سے جنکو وہ خدا کا فرستادہ بیان کرتے ہیں۔

ان مذاہب کو اصول و اساس کی حیثیت سے بے بنیاد کہہ دینے کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ اس شخص کی نبوت سے انکار کر دیا جائے جس کی وجہ سے یہ خدا سے رشتہ

جوڑتے ہیں اگر کوئی موسیٰ کو بے اصل شخص کہہ دے تو یہودیت کی بنیاد منہدم ہو جائیگی
اسی طرح عیسائیت کا قلعہ بیخ و بن سے گر جاتا اگر اسلام عیسیٰؑ کے متعلق یہ کہتا
کہ وہ خدا کے سفیر نہ تھے۔ بلکہ ہمارے ایسے معمولی انسان تھے۔ مگر جب ہم قرآن مجید
کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بلا استثناء۔ اسلام نے کسی مذہب کے متعلق
یہ آواز نہیں بلند کی کہ وہ اصل اور بنیاد کے اعتبار سے باطل ہے بلکہ اس نے مجمل الفاظ
میں کہا کہ تصدیق کرتا ہوں۔ اپنے تمام پیش رؤوں کی اس طرح اس نے اپنے دائرۂ عمل کو
اس قابل قرار دیا کہ ہر مذہب والا اپنے اصل اصولِ مذہب کو صحیح سمجھنے کے ساتھ
مذہبِ اسلام کو تسلیم کرے۔ صاف الفاظ میں کہوں کہ اسلام اگر یہ کہتا کہ حضرت موسیٰ
خدا کے پیغمبر نہ تھے تو یہودی اپنے مذہب کی حقانیت کو اپنے دل میں جگہ دیتے ہوئے
اسلام کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اسلام یہ کہتا کہ عیسیٰ معاذ اللہ دروغ گو تھے۔ تو عیسائی اپنے
دل میں عیسائیت کو جگہ دیتے ہوئے اسلام کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ مگر اسلام نے یہ
اعلان کیا کہ میں کسی پیش رو کو کسی کے مقتدا کی ہستی کو اس کی عظمت اور کمالات کو نبوت
کے درجہ سے گرانے نہیں آیا۔ اس نے کسی کے لیے یہ نہیں کہا کہ یہ غلط ہے اور باطل
ہے بلکہ بار بار اس حقیقت کو پیش کیا کہ میں اپنے پیش رؤوں کی تصدیق کرتا ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک باقی رہے ان تمام عقیدوں پر جو اسے
اپنے رہنماؤں کے ساتھ حاصل ہیں۔ لیکن میں تمہارے سامنے ایک قانونِ اصلاح
پیش کرتا ہوں آؤ اس کو بھی قبول کر لو۔ پہلے کی نفی نہ کرو لیکن اس جزو کو تسلیم کر
لو۔ اگر کہیں پر سے انکار کا محل ہوتا تو (چونکہ نفی و اثبات جمع نہیں ہو سکتے) تصادم
کی گنجائش تھی، جیسے مشرکین کے مقابلہ میں مسئلۂ توحید میں " لا اِلٰہ اِلّا اللہ " پہلے
ہی جس چیز کو نمایاں کیا گیا وہ نفی ہے۔ وہ ٹکراتی ہے اس بات سے جو اس کے
ذہن میں تھی لیکن مسئلۂ نبوت میں اسلام نہیں کہتا لا نبی الا محمد۔ رسولؐ

کی زبان سے یہ نہیں نکلتا کہ لا رسول الا انا "کوئی رسول نہیں ہے سوائے میرے"۔ بے شک اگر ایسا ہوتا تو تمام مذاہبِ عالم کے ساتھ بنائے مخاصمت پیدا ہو جاتی۔ بلکہ اس کے خلاف قرآن مجید کہہ رہا ہے۔ ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ نہیں ہے میرا بندہ خاص محمدؐ مگر ایک رسول جس کے قبل بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔" جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے معیار کو تمام پیش روؤں کے ساتھ مساوی قرار دے رہے ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں۔ اس طرح ہر ایک انسان ان تمام جذباتِ عقیدت کے ساتھ جو اپنے رہنماؤں کے ساتھ ہیں اسلام کے جامعہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس کو دو لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے۔

٢/٤٠

وامنوا بما انزلت مصدقاً لما معکم "سب اس میں داخل ہیں ایمان لاؤ اس شے پر جو ہم نے اب نازل کی ہے۔" تسلیم کرتے ہوئے ان تمام چیزوں کو جو تمہارے پاس موجود ہیں تم کو کسی نقطہ پر خطِ نفی کھینچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم مانے جاؤ موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو مگر اس رسولؐ کو بھی تسلیم کر لو۔

٢/٨٨

ولما جاءھم کتاب من عند اللہ مصدق لما معھم وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ۔

"جب ان کے پاس آئی وہ کتاب جو تسلیم کرتی ہے تمام ان کتب کو جو ان کے پاس ہیں اور اس سے قبل وہ خود امیدیں ظاہر کرتے تھے اس کتاب کے متعلق لیکن اب وہ انکار کرتے ہیں۔" دیکھیے ایک چیز یہ تھی کہ وہ کسی چیز کا اثبات کرنے والے ہوں اور مذہبِ اسلام نفی کرتا ہو تو یہاں مذہبِ اسلام کے جانب سے بنائے مخاصمت قائم ہوتی ہے۔ اور ایک یہ بات ہے کہ مذہبِ اسلام کسی کی بھی نفی نہیں کرتا لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں مانتے۔ یہاں جو کچھ

بنائے مخاصمت پیدا ہوتی ہے وہ ادھر سے، اسلام پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اسلام کو یہ شکوہ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز ہم پیش کرتے ہیں اور یہ نہیں مانتے۔ واذا قیل لھم اٰمنوا بما انزل اللّٰہ قالوا نؤمن بما انزل علینا ویکفرون بما وراءہ وھو الحق مصدقا لما معھم۔ وہی بنائے مخاصمت پیش کی جارہی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ کوئی چیز پیش کرتے ہیں اور ہم نہیں مانتے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ اس پر جو خدا نے نازل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں بس! جو ہمارے اوپر نازل ہوچکا ہے ہم اسی پر ایمان لاتے ہیں، اس کے علاوہ انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ حق ہے اور تصدیق کرنے والا ہے ان چیزوں کی جو اُن کے پاس ہیں۔"

یہاں دونوں پہلو پیش کر دیے قرآن کا اقرار ان ہستیوں اور شخصیتوں کے ساتھ جن کو وہ مانتے ہیں اور ان کا انکار اس اصول سے جس کو اسلام پیش کر رہا ہے۔ اس کے بعد یہ کہا گیا کہ ان کے سامنے اعلان کردو کہ ہمارا یہ شیوہ نہیں ہے کہ ہم انبیاء میں سے کسی کو تسلیم کریں اور کسی کو نہ کریں، ہم تو سب کو تسلیم کرتے ہیں، تو ہم تم سے بھی یہی چاہتے ہیں کہ تم بھی سب کو تسلیم کرلو۔

ارشاد ہوتا ہے۔ قولوا اٰمنا باللّٰہ وما انزل الینا وما انزل الیٰ ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیّون من ربھم لا نفرّق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون

یہ آیت بنیاد ہے اس تمام میرے بیان کی جس کو میں آپ کے سامنے اسلامی رواداری کے شعبہ میں عرض کر رہا ہوں۔

ارشاد ہوتا ہے مسلمانوں سے خطاب کرکے "یہ کہو تم مذاہب عالم سے کہ ہم تو ایمان لائے ہیں خدا پر اور اس پر جو ہماری جانب نازل ہوا اور جو نازل ہوا تھا ابراہیم

پر، اسمٰعیل پر اور جو تعلیمات ملے تھے اسحٰق اور یعقوب اور اسباط بنی اسرائیل اور موسیٰ و عیسیٰ کو اور جو دوسرے نبیوں کو ملے تھے ان کے رب کی طرف سے سب کا ہم اقرار رکھتے ہیں ہم ان میں تفریق نہیں ڈالتے کہ کسی پر ایمان لائیں اور کسی پر ایمان نہ لائیں، اور ہم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں (تو اب تم بھی سب چیزوں پر ایمان لے آؤ۔ جس سے کہ ہم مومن ہیں)

فان امنوا بمثل ما امنتم فقد اهتدوا وان تولوا فانما هم فی شقاق فسیکفیکهم الله هو السمیع العلیم

اگر یہ بھی ایمان لے آئیں انھی چیزوں پر جن پر تم ایمان لائے ہو تو یہ ہدایت پا گئے اور اگر انھوں نے روگردانی کی تو یاد رکھو پھوٹ ڈالنے والے یہی ہیں (شقاق کے معنی ہیں شق ہو جانے کے۔ لفظی معنی ہوئے پھوٹ ڈالنا) تو تمھیں کوئی پروا نہیں خدا تمھارا مددگار ہے اور وہ تمھاری آواز کا سننے والا ہے۔ تمھارے حالات سے باخبر ہے یہ جزو فسیکفیکهم الله هو السمیع العلیم۔ مسلمانوں کے قوتِ انتقام کو روکنا ہے۔ یعنی اگر انھوں نے روگردانی کی تو یہی پھوٹ ڈالنے والے ہیں مگر اب تم تلواریں لے کر ان پر جا پڑو؛ نہیں بلکہ خدا کے حوالہ کرو۔ ذمہ داری تو ان پر عائد ہے لیکن تم؛ خبردار حد سے نہ بڑھنا۔ خدا تمھارا والی ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔ اٰمن الرسول بما انزل الیه من ربه والمؤمنون کلٌّ اٰمن بالله وملٰئکته وکتبه ورسله لا نفرق بین احد من رسله

ہمارا رسولؐ خود اقرار کرتا ہے، "ایمان لایا ہے ان چیزوں پر جو اس پر نازل ہوئیں خدا کی طرف سے اور وہ جو ایمان لائے ہوئے ہیں اس کے ساتھ۔ ہر ایک ان میں سے ایمان لاتا ہے کتابوں پر، ملائکہ پر، رسولوں پر، اور اس کے پیغمبروں میں سے کسی

میں تفریق نہیں کرتا۔" ہم کسی کا انکار نہیں کرتے۔ نزل علیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ۔ اس نے نازل کیا تمہارے اوپر کتاب کو حق کے ساتھ جو تسلیم کرنے والی ہے اس کو جو اس کے پہلے تھا۔ کوئی تعیین نہیں کی توریت کی، انجیل کی، بلکہ تمام کتابیں جو پہلے کی ہوں ان میں سے کسی کو وہ جھٹلانے پر تیار نہیں ہے۔ دوسری آیت میں ہے۔

وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدی للناس وانزل الفرقان

"اس نے نازل کیا توریت کو اور انجیل کو، ان کے نام خصوصیت سے اس لیے لے لیے کہ جس وقت قرآن نازل ہوا ہے جو لوگ براہِ راست مخاطب تھے، وہ یہودی اور نصاریٰ ہی تھے، اس لیے عمومی دائرہ میں تو سب کو لے لیا اور خصوصیت سے انجیل اور توریت کا نام لے لیا۔ اگر اس زمانہ کے عربوں کے سامنے مثلاً نام لیا جاتا ہندوستان کی کتابوں کا جن کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے تو کون سمجھتا اس کو عموم میں رکھا، نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ امکان ہے اس میں ہر ایک کے آجانے کا۔ آگے چل کر ارشاد ہوا کہ وہ بھی لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوئی تھیں۔ اسی خدا نے قرآنِ مجید بھی نازل کیا ہے۔

قل اٰمنا باللہ وما انزل علینا وما انزل علی ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ والنبیون من ربھم لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون۔

شبہ ہوگا کہ یہ آیت وہی ہے جو پہلے ذکر ہو چکی، نہیں۔ یہ دوسری آیت ہے اس میں "قولوا" تھا، اس میں "قل" ہے۔ وہاں تمام مسلمانوں سے کہلوایا گیا، یہاں صرف رسولؐ سے کہلوایا جا رہا ہے مگر بحیثیت نمائندہ تمام عالمِ اسلام۔ "تم کہو اے رسولؐ! کہ ہم سب ایمان لائے ہیں اس پر جو ہمارے اوپر نازل ہوا ہے اور اس پر جو

نازل ہوا ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ وغیرہ وغیرہ پر۔

اس طرح سب کے لیے جگہ رکھی آیت نے عموم پیدا کر کے اور کچھ کا نام لے دیا، جگہ دی ہر مذہب والے کو یہ کہہ کر کہ والنبیّون من ربھم۔ تمام وہ نبی جو رب کی طرف سے بھیجے۔ ان سب پر ہم ایمان لائے۔ کسی میں تفریق نہیں قرار دی۔ "یا ایھا الذین اوتوا الکتاب اٰمنوا بما نزّلنا مصدقا لما معکم"۔ اے وہ کہ جو کتابِ خدا کے ماننے والے ہو اس کو بھی مان لو جس کو ہم نے اتارا ہے۔ پھر جو اتارا ہے یہ خلاف نہیں ہے اس کے جو تمہارے پاس تھا۔ یہ تو اس کی تصدیق کرتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔ ان الّذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا اولئک ھم الکافرون حقا واعتدنا للکافرین عذابا مھینا۔

"وہ لوگ کہ جو کفر اختیار کرتے ہیں، انکار کرتے ہیں خدا کا اور اس کے رسولؐ کا اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ تفریق ڈالیں خدا اور اس کے پیغمبروں کے درمیان اور یہ کہتے ہیں کہ بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا کفر کرتے ہیں (یہودی کہتے ہیں ہم موسیٰؑ پر ایمان لائے ہیں، مگر عیسیٰؑ پر ایمان نہیں لائے، نصاریٰ کہتے ہیں، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو مانتے ہیں مگر محمد مصطفےٰؐ پر ایمان نہیں لاتے) یہ چاہتے ہیں کہ ایک درمیانی راستہ اختیار کریں۔ یہ لوگ بے شک کافروں میں داخل ہونے کے لائق ہیں اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

پھر ارشاد ہوتا ہے۔ والذین اٰمنوا باللہ ورسلہ ولم یفرقوا بین احد منھم اولٰئک سوف یؤتیھم اجورھم وکان اللہ غفورا رحیما۔

"جو ایمان لائے ہیں خدا اور اس کے تمام رسولوں پر اور ان میں تفریق نہیں کرتے ہیں وہ بلاشبہ مغفرت کے مستحق ہیں۔"

انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ واوحینا الی ابراھیم واسمعیل واسحق ویعقوب والاسباط وعیسیٰ وایوب ویونس وھٰرون وسلیمان واتینا داؤد زبورا ورسلا قد قصصنا ھم علیک من قبل ورسلا لم نقصصھم علیک وکلم اللہ موسیٰ تکلیما۔

یہاں ایک حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کچھ "انبیاء" اور "مرسلین" وہ ہیں جنھیں صریحی طور سے تسلیم کیا گیا ہے جیسے عیسیٰ، موسیٰ، ابراہیم۔ ان کے نام قرآنِ مجید میں صریحی طور سے موجود ہیں۔ اور بہت سے وہ اشخاص ہیں جن کو بہت سے لوگ اپنا پیشوا مانتے ہیں اور بہت سے لوگ انکی نبوت کے مدعی ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں ان کی صریحی طور سے تفصیل نہیں ہے۔ جیسے زردشت، ان کے متعلق کتاب سماوی بھی کہا جاتا ہے کہ موجود ہے، ایرانیوں کے پاس جو خدا کی طرف سے مانی جاتی ہے۔ "ژند" اصل کتاب ہے اور "پاژند" اس کی شرح ہے جو ان کے نزدیک الہامی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر شروح و حواشی تحریر کیے گئے ہیں یا جیسے ہندوستان کے مختلف مذاہب، جو اپنے پیشواؤں کو مانتے ہیں اور ان کے لیے ایک شریعت کے قائل ہیں۔ ظاہری نظر میں مسلمان یہ نہیں کہہ سکتے، کہ وہ سب سچے تھے مگر ایسا بھی نہیں کہ زردشت کو غلط سمجھیں اور نہ ان کو جو دوسرے مذاہب کے پیشوا ہیں ان کو کاذب سمجھیں محض اس لیے کہ اسلام نے ان کی تفصیل نہیں کی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جب ان کی عظمت کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں ہے تو ایسے الفاظ بھی استعمال کر دیے جاتے ہیں جو ایک رہنمائے مذہب کی شان کے خلاف ہیں۔ ایسے الفاظ استعمال کر دیے جاتے ہیں جو ایک جھوٹے شخص

کے لیے استعمال ہوتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف جذبۂ عناد پیدا ہوتا ہے لیکن قرآن نے زبان بندی کر دی یہ کہہ کر کہ ہم نے کچھ لوگوں کے نام لے کر تفصیل کی ہے اور کچھ لوگوں کے ناموں کی تفصیل نہیں کی۔ اس لیے کہ ثابت نہ ہونا اور بات ہے اور غلط ہونا اور بات ہے۔ اگر قرآن میں موسیٰؑ کا تذکرہ نہ ہوتا تب بھی ہم موسیٰؑ کو جھوٹا ماننے کا حق نہیں رکھتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ یقینی طور سے سچا سمجھنے کی کوئی وجہ نہ ہوتی تمام انبیاء کے لیے یہ ہے کہ چاہے ثابت نہ ہو اس لیے ہم ایمان نہ لائیں لیکن انکار بھی نہ کریں۔ زردشت اور دوسرے پیشوا جن کو مختلف مذاہب مانتے ہیں، قرآن نے موقع ضرور دیا ہے ان کی سچائی کا۔ اگر قرآن یہ کہہ دیتا کہ جن کے نام ہم نے بتا دیے بس اتنے ہی ہیں اور کوئی نہیں ہے تب تو ہم یقینی طور سے ان کو غلط گو کہنے کا حق رکھتے لیکن قرآن انہی پر حصر نہیں کرتا۔ تو اب آپ کو کسی کے دعوے کو غلط کہنے کا حق نہیں ہے۔ قرآن تو صراحتاً یہ ارشاد کرتا ہے کہ ورسلا لم نقصصهم علیک۔ (یعنی) "بہت سے ایسے بھی تھے جن کا ہم نے ذکر نہیں کیا" تو معلوم ہوا کہ جن کے نام لیے گئے ہیں قرآن مجید میں اور ان کے علاوہ بھی کچھ تھے ایسے افراد جن کے نام نہیں لیے گئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے غلط گو دعویٰ کرنے والے بھی گزرے ہیں جن کی خبر برابر توریت میں دی گئی ہے۔ رسولؐ کے زمانہ میں بھی ہوئے ہیں۔ مسیلمہ کذاب نبوت کرنے لگا تھا زمانۂ رسولؐ میں ایک عورت نے بھی دعویٰ کر دیا تھا۔ اور ایسے ہی لوگ ہر زمانہ میں ہوا کیے ہیں تو اسی وجہ سے آشیانۂ نبوت دو عملہ میں پڑ گیا۔ یعنی آیت یہ کہہ رہی ہے کہ بہت سے رسول ایسے ہیں جن کے نام نہیں ذکر کیے گئے۔ اس میں زردشت بھی آ سکتے ہیں، اس میں اور دوسرے پیشوایانِ مذہب بھی آ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ چونکہ نام نہیں لیے گئے اور یہ معلوم ہے کہ غلط گو بھی کچھ ہوئے ہیں دنیا میں اس لیے ان میں سے ہر

ایک جس کا نام قرآن میں نہیں آیا ہے ہمارے لیے مشکوک حیثیت رکھتا ہے لہٰذا بحیثیت مسلمان ہم ایمان لانے کی کوئی وجہ نہیں پاتے۔ زردشت پر۔ کرشن جی پر اور دوسرے اوتاروں پر۔ لیکن یہ بھی حق نہیں ہے کہ ہم انھیں برا کہیں اور کلمات ذلت آمیز استعمال کریں۔ بلکہ اگر کسی شخص کے لیے تاریخی بنا پر یا دوسرے قرائن سے ثبوت حاصل ہو جائے ان میں سے کسی کی نبوت کا تو اسلام اس کے ماننے سے بھی مانع نہیں ہے۔ اور عملی حیثیت سے ہماری زندگی پر اس کا کوئی اثر بھی نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ موسیٰؑ تو بنص قرآن نبی ہیں مگر موسیٰؑ کی شریعت کو اسلام نے منسوخ کر دیا ہے ویسی ہی برفرض رسالت زردشت وغیرہ کی بھی شریعت منسوخ قرار پائے گی۔ لہٰذا وہ اب عملی چیز بہر حال نہیں ہے۔ فرض کیجیے آپ نے اپنے ملازم سے کسی کام کو کہا۔ بلند آواز سے کہا تھا مگر وہ سو رہا تھا جب اس کام کا وقت گزر گیا تو اس کی آنکھ کھلی، اسے معلوم ہوا کہ یہ حکم ہوا تھا۔ جان تو لیا مگر اب جان کر کرے کیا! کچھ بھی نہیں۔ اس لیے کہ وقت اس عمل کا گزر گیا۔ ویسا ہی یہ ہے کہ زردشت نبی تھے یا نہیں؟ ہوں نبی، اگر سابق شریعتیں تو سب منسوخ ہو چکیں انہی میں زردشت کی کتاب بھی سہی۔ یہ دید بھی سہی۔ اس کا عملی نتیجہ کچھ نہیں۔ بے شک مسلمانوں کو اس سے وہ سبق ضرور ملتا ہے۔ جیسے ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ کسی دوسرے مذہب کے پیشواؤں کے خلاف تم بے ادبی سے اعتراض نہ کرو۔ بلکہ اگر تم تاریخی قرائن کی بنا پر ان میں سے کسی کی بجائے خود کسی عظمت کے بھی قائل ہو جاؤ تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اگر یہ دل نشین ہو جائے تو بہت سے عناد و مخاصمت کے دروازے بند ہو جائیں۔

ارشاد ہوتا ہے۔ یہودیوں کے مقابل میں عندھم التوریۃ فیھا حکم اللہ ثم یتولون من بعد ذلک۔ "ان کے پاس توریت موجود ہے مگر عمل نہیں کرتے۔"

اس کے علاوہ یہ ارشاد ہوتا ہے۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون۔ جو لوگ خدا کی اتاری ہوئی بات کے ساتھ

فیصلہ نہیں کرتے یہ انکار کرنے والے کافر ہیں"۔

معلوم ہوا کہ اسلام نے یہ اصول قرار دیا ہے کہ ہم کسی مذہب کا اس کے اصل اور بنیاد کے اعتبار سے انکار نہیں کرتے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ تمھارا مذہب ایک صحیح اصول پہ مبنی اور ایک صحیح بنیاد پہ قائم ہے یہ عام افراد کی کارستانی ہے کہ غلط فہمیاں شریک کر دی ہیں، ہر مذہب بحیثیت روح و جوہر کے حق ہے۔ روح تمام مذاہب کی ایک ہے اس لیے یہ ارشاد ہوا کہ اسلام کو کوئی نیا مذہب نہ سمجھو، اصل دین تو کبھی بدلتا ہی نہیں۔ اصل تو سب کی ایک ہی ہے۔ موسائیت درحقیقت اسلام ہے۔ عیسائیت حقیقتاً اسلام ہے۔ زردشتیت درحقیقت اسلام ہے۔ فروع اور چیز ہیں ان کا نام ہوتا ہے شریعت لیکن دین نام ہوتا ہے اصول کا۔ دین ایک ہی ہوتا ہے۔ دین میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

لاتبدیل لسنۃ اللہ "خدا کے مقرر کیے ہوئے راستے میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ ان الدین عند اللہ الاسلام۔" دین تو بس خدا کے یہاں ایک ہی ہے جس کا نام ہے اسلام۔" اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ آدم آئے انھوں نے کیا کہا؟ مجھے تسلیم کرو۔ جو مانے "وہ مسلم" جو نہ مانے وہ کافر۔ نوحؑ آئے کہا۔" مجھے تسلیم کرو۔ جس نے مانا وہ مسلم جس نے نہ مانا وہ کافر۔" ابراہیمؑ آئے۔ کہا۔ مجھے تسلیم کرو۔ جس نے مانا وہ مسلم جس نے نہ مانا وہ کافر۔" موسیٰؑ آئے۔ کہا "مجھ کو مانو جس نے مانا وہ مسلم جس نے نہ مانا وہ کافر۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ دین میں ہمیشہ بس مسلم اور کافر ہی کی تفریق رہتی ہے۔ دینِ حق کے ماننے والے ہمیشہ مسلم رہے الگ جانے والے ہمیشہ کافر رہے۔

اس لیے یہ ارشاد ہوا کہ درحقیقت یہ تمام مذاہب ایک ہی ہیں نام کی تبدیلیاں بعد کو پیدا ہو گئی ہیں۔ مفہوم "مسلم" پہلے سے تھا۔ لقب ابراہیمؑ نے دیا۔ ھو سماکم المسلمین یہ نہیں کہا تھا کہ تمھیں مسلم بنایا انھوں نے، مسلم ہمیشہ سے تھا۔ نام یہ ابراہیمؑ نے قرار دیا

وجہ تسمیہ پہلے سے موجود تھی۔ اسم بعد کو معین ہوا۔

اس کے علاوہ اعلان کیا کہ ولکل امۃ رسول۔ دنیا میں کوئی ملک اور کوئی امت نہیں، ایسی جس میں ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا ہے، "ہر امت کے لیے ایک رسول ہے"

اس سے ظاہر ہے کہ اسلام نے کسی مذہب کے خلاف اس کے اصل و بنیاد پر کوئی ایسا خطِ انکار نہیں کھینچا کہ دنیا کو اسلام کے مقابلہ میں صف آرائی کی ضرورت ہوتی بلکہ اس نے کہا کہ اسلام تو درحقیقت وہ چیز ہے جس کو تمام انبیاء اور مرسلین لائے تھے۔ اسلام کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اسلام ہر زمانہ میں اسلام تھا۔ اور ہر زمانہ میں اس کے مقابل کفر تھا۔ مفہوم اسلام اور کفر کا نہیں بدلا۔ مفہوم ایک ہی ہے۔ جیسے ایک شخص نے اپنے تمام دوستوں سے خواہش ظاہر کی ہے کہ تم ہماری اولاد کو عزت کی نظر سے دیکھنا۔ اتفاق سے جس وقت اس نے یہ خواہش پیش کی تھی اس وقت اس کے ایک ہی فرزند تھا۔ سال بھر کے بعد اسکے یہاں ایک اور فرزند ہوا اور وہ بڑھا، تو حکم وہی ایک۔ مفہوم نہیں بدلتا۔ اس کے بعد مردم شماری اور بڑھی نسل میں ترقی ہوئی۔ افراد میں کثرت پیدا ہوئی۔ جتنی چاہے اولاد میں کثرت ہو جائے، مفہوم نہیں بدلتا۔ لیکن مصداق میں تغیر پیدا ہوتا ہے اگر کسی نے ایک کی مخالفت کی تو اس حکم سے عدول ہوگا، لیکن اس وقت میں وہ ایک ہی تھا اور اب ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی تو کیا معنی بدل گئے؟ معنی تو وہی ایک رہے لیکن وسعت میں اس معنی کے فرق ہو گیا، ویسے ہی "اسلام" کیا؟ تسلیم کرنا خدا کے پیغام کا۔ اور کفر کیا؟ نہ ماننا۔ جس وقت آدم مبعوث ہوئے ایک نبی دنیا میں آیا تھا، اس لیے اسلام کیا تھا؟ اس کا ماننا، اور کفر؟ اس کا نہ ماننا۔ نوحؑ آئے، اب اسلام کیا ہے؟ معنی میں اسلام کے کوئی تفریق نہیں ہے۔ اب بھی وہی ہے۔ "خدا کے پیغام کا ماننا" اور اس کے فرستادہ کا تسلیم کرنا۔ لیکن فرستادہ پہلے فقط آدمؑ ہی کی ذات تھی، اب نوحؑ کا اضافہ ہو گیا۔ لہٰذا جو نوحؑ کو نہ مانے اس نے پیغامِ الٰہی کو تسلیم نہیں کیا۔ کل تک فقط آدمؑ کا ماننے والا مسلم تھا آج وہی فقط آدمؑ کا

ماننے والا کافر۔ اس کے بعد "نبوت" پہنچی حضرت ابراہیمؑ تک، مفہوم اسلام کا کیا؟ وہی پیغمبر کو تسلیم کرنا، لیکن کل تک صرف آدمؑ و نوحؑ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا مسلم تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی ضرورت نہ تھی، اس لیے کہ وہی تو تھے۔ اب جس وقت ابراہیمؑ مبعوث ہوئے تو اب بھی مفہوم "اسلام" و "کفر" کا وہی تھا۔ مگر اب: آج فقط آدمؑ و نوحؑ کا ماننا کفر ہے۔ اس کے بعد موسیٰؑ آئے۔ اسلام کچھ بدل گیا؟ نہیں! وہی رہا۔ یعنی تسلیم کرنا خدا کے پیغام کا۔ مگر کل تک آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ کا ماننے والا مسلم تھا آج جب موسیٰؑ آئے تو ان کو نہ ماننا اور سب کو ماننا کفر ہے۔

اس کے بعد سلسلہ اور بڑھا، عیسیٰؑ آئے، اسلام وہی رہا، لیکن نتیجہ مختلف ہوگیا۔ اب موسیٰؑ پر ایمان لانے والا کل تک مسلمان تھا آج موسیٰؑ پر ایمان لانے والا اور مسیحؑ پر ایمان نہ لانے والا کافر ہے۔

اب عیسیٰؑ کے بعد خطِ نبوت کھنچا نقطۂ خاتمیت تک پہنچا۔ جناب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے۔ کیا اسلام اب کوئی نیا اسلام ہوگیا؟ ان تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ وہی خدا کی فطرت، وہی خدا کی پہلی بات، خدا کا طریقہ۔ راستہ اب بھی نہیں بدلا اسلام بھی وہی ہے، کفر بھی وہی ہے لیکن نتیجہ مختلف ہوگیا۔ کل تک عیسیٰؑ کو مان کر خاموش ہوجانے والا مسلم تھا آج عیسیٰؑ کو مان کر کسی ایک ہستی کو نہ ماننے والا کافر ہے۔

اسلام کا مفہوم ہرگز نہیں بدلا۔ بلکہ جتنا دائرہ آگے بڑھتا جاتا ہے اتنی دائرہ میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں نے یہودی کو بھی مسلم بنا دیا، میں نے عیسائیوں کو بھی مسلم بنا دیا۔ میں اصل کے اعتبار سے سب کو مسلم کہہ رہا ہوں۔ ہر ایک اپنے نقطۂ ابتدا کے اعتبار سے مسلم تھا بعد والے رسول کو نہ ماننے پر کافر قرار پا گیا۔

معلوم ہوا کہ اسلام نے کوئی بات ایسی نہیں قائم کی جو سبب افتراق ہو، لیکن انکار جہاں سے شروع ہوا وہاں سے افتراق پڑا۔ وان تولوا فانما ھم فی شقاق۔ اگر یہ

لوگ روگردانی کریں تو درحقیقت افتراق ڈالنے والے یہ ہیں۔

اس کے بعد یہ دیکھیے کہ اسلام نے مسلمانوں کو کیا ہدایت کی؟ کیا یہ ہدایت کی کہ بس اب تمہاری تلواریں ان کے قلع قمع میں صرف ہو جائیں؟ بس اب ان کی جماعت کو منتفرق کر دو بس اب ان کے وجود سے صفحۂ ارض کو پاک و صاف کر دو؟ کیا یہی حکم تھا مسلمانوں کو؟ ہرگز نہیں۔

بلکہ مختلف طرح مسلمانوں کو تشدد سے روکا۔ رسالتمآبؐ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا۔

افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین۔ "کیا تم لوگوں پر جبر کرو گے؟ یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں"۔

کبھی یہ ارشاد کیا۔ وما انت علیھم بمصیطر۔ "تمہیں ان پر جبری طاقت نہیں دی گئی"۔ ما علی الرسول الا البلاغ۔ "ہمارے رسول پر جو ہے وہ تبلیغ کر دینا ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے"۔ رسولؐ کو یہ تعلیم دی کہ تم کہو:۔ وما علینا الا البلاغ۔ "اس سے زیادہ تمہارے اوپر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا"۔

پھر جس وقت کفار و مشرکین کو مخاطب کیا گیا ہے، کیسا روادارانہ انداز کارفرما ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ قل اتحاجوننا فی اللہ وھو ربنا و ربکم۔ حالانکہ توریت میں خدا کو اسرائیل کا خدا کہا جاتا ہے۔ انجیل میں بھی اس کی اولاد میں اپنے ہی کو بتایا گیا ہے کہا گیا ہے ہمارا وہ باپ ہے اور ہم اس کی اولاد ہیں۔

قرآن مجید نے ان کے خیال کو نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں نحن ابناء اللہ و احباؤہ۔ "ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں"۔

اسی طرح ان لوگوں کا مزعومہ یہ تھا کہ خدا کے ساتھ جو رشتہ ہم کو حاصل ہے وہ کسی کو حاصل نہیں ہے۔ خدا تو ہمارا ہی خدا ہے۔ دوسروں کا نہیں ہے۔ تقاضا تو جواب کا بھی تھا کہ جب یہود کہتے کہ خدا ہمارا، نصاریٰ کہتے کہ خدا ہمارا تو اسلام

بھی کہتا کہ خدا ہمارا۔ اور کسی کا نہیں۔ لیکن اسلام کی رواداری، ایسی تنگ خیالی کی موید نہیں تھی۔ اسلام نے اعلان کیا۔ کہ وہ "رب العالمین" ہے۔ یعنی جتنے عالم ہیں وہ سب کا رب ہے نہ ہمارا نہ تمھارا ہے، وہ توسب کا ہے، سب کے ساتھ اس کو ایک نسبت حاصل ہے۔ اس کو تشریح کے ساتھ ظاہر کیا۔ اس طرح اتحاجوننا فی اللہ ھو ربنا و ربکم۔ تم خدا کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو؟ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ اس کا ہمارے اور تمہارے ساتھ یکساں تعلق ہے یکساں ربط ہے۔ لنا اعمالنا و لکم اعمالکم" ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں تمھارے لیے تمھارے اعمال ہیں۔" اس میں مخاصمت کیسی؟

بہرحال ہم کو بھی اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا ہے اور تم کو بھی اپنی ذمہ داری پوری کرنی ہے۔ ہمارے اعمال کی بھی جواب دہی خدا کے یہاں ہے تمھارے عمل کی بھی جواب دہی خدا کے یہاں ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کی یہ آرزوئیں، تمنائیں نہیں کہ جب ہم ہی خدا کے ساتھ رشتہ محبت رکھتے ہیں، تابعداری کرتے ہیں توبس نجات بھی ہماری ہی ہے۔ وقالوالن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا اونصاریٰ تلک امانیھم قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہ داخل ہوگا جنت میں مگر وہ کہ جو یہودی ہو یا نصرانی ہو۔ ارشاد ہوتا ہے یہ ان کی آرزو اور امید کے باغ ہیں جو ان کی نظروں کے سامنے لہلہاتے ہیں۔" ان سے کہو کہ ہم تو دلیل کے پابند ہیں" فقط زبانی دعوؤں سے کام نہیں چلتا ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔ "دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔"

اسلام ان کے مقابلہ میں آکر تمام دنیا کے سامنے کہنے کا حق رکھتا تھا کہ نہیں داخل ہوگا جنت میں مگر وہ کہ جو مسلم ہو۔ اس لیے کہ کافر جنت میں نہیں جا سکتا۔ اگر کہتا بھی تو سچ کہتا۔ مگر اپنے مخاطبہ میں انداز رواداری کو محفوظ رکھتے ہوئے اسلام نے یہ نہیں

کہا کہ تم غلط کہتے ہو۔ درحقیقت مسلم ہی بحیثیت مذہب بحیثیت فرقہ اس کے حقدار ہیں کہ جنت میں جائیں، بلکہ اسلام نے ایک معیار پیش کر دیا۔

ارشاد ہوتا ہے۔ بلیٰ من اسلم وجھہ للہ وھو محسن فلہ اجرہ عند ربہ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔

"بے شک جنت کا مستحق وہ ہے جو خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے اور اچھے اچھے کام کرے۔ اس کے لیے اس کا اجر ہے خدا کی بارگاہ میں اور کوئی خوف اور حزن اس کے لیے نہیں ہے روزِ قیامت"۔

اگر تم پر یہ معیار منطبق ہوتا ہے تو تم ہی جنت کے مستحق سہی اور اگر ہم پر ہے تو ہم جنت کے مستحق۔ اس طرح اندازِ بیان میں نرمی کا لحاظ رکھا گیا۔ مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا:۔

لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوء یجزبہ ولا یجد لہ من دون اللہ ولیا ولا نصیرا۔

"اے مسلمانو! اپنے اسلام پر بھول نہ جانا، جنت کی بنیاد نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے نہ اہلِ کتاب کی آرزو پر، نہ تمہارے خیالات کے سبز باغ جنت کے حاصل کرنے کے ذمہ دار ہیں اور نہ اہلِ کتاب کے"۔ جو بُرا کام کرے گا اس کو اس کا بدلا دیا جائیگا مسلمان بحیثیت مسلمان صرف اس لیے کہ اسلام کے دائرہ میں ہیں۔ یہودیوں کی طرح یہ نہ کہیں کہ بس ہمارے لیے نجات ہوگی۔ قرآنِ مجید مسلمانوں کو ایک صف میں کھڑا کر رہا ہے، یہود و نصاریٰ کے ساتھ۔ اہلِ کتاب کی یہ تمنائیں تھیں کہ بس یہودیت ہی کافی ہے یا نصرانیت ہی کافی ہے۔ مگر مسلمانوں سے خطاب ہو رہا ہے، "تم صرف اسلام کو، صرف کلمہ کے زبان پر جاری کرنے کو کافی نہ سمجھ لو۔ کچھ نہیں ہوتا تمہاری آرزوؤں سے"۔ جو برا کام کرے اس کو بدلا دیا جائے گا اور

خدا کے سوا کوئی مددگار اس کو نہیں ملے گا نہ انھیں اور نہ تمھیں۔"

اس کے بعد مسلمانوں کو رواداری کی تعلیم دینے کے لیے ارشاد کیا کہ تم اپنی خبر لو۔ کسی کو نہ کہو کہ تمھیں نجات نہیں ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اہتدیتم الی اللہ مرجعکم جمیعاً فینبئکم بما کنتم تعملون۔

"اے اسلام لانے والو، تمھیں اپنے نفسوں کی خبر رکھنا چاہیے۔ تم اپنے نفسوں سے ہوشیار رہو۔ اگر دوسرا گمراہ ہے تو تم ہدایت کے راستے پر رہو خدا کی طرف تم سب کی بازگشت ہے، وہ تمھیں خبر دے گا ان تمام اعمال کی جو تم بجا لاتے رہے ہو۔"

یعنی عمل کی بازپرس وہاں ہوگی تم اپنی داخلی اصلاح کرو۔ دوسروں سے لڑنے جھگڑنے سے کیا مطلب؟ دوسروں کے کام ان کے ساتھ ہیں، تم اپنی طاعت کے جادہ پر قائم رہو۔ اس کے بعد رسول ؐ سے مخاطب ہو کر ارشاد ہوتا ہے:۔

وان کذبوک فقل لی عملی ولکم عملکم انتم بریئون مما اعمل وانا بریئ مما تعملون۔

'اگر یہ تمہاری تکذیب کرتے ہیں (معلوم تو ہوتا ہے کہ جواب اس کا بہت سخت ہوگا، مگر نہیں، ایسا جواب نہیں تعلیم ہوتا) تو حرج کیا ہے، تم ان سے کہو کہ ہم اپنے کام کے ذمہ دار ہیں۔ اور تم اپنے کام کے ذمہ دار ہو۔ تم بری ہو اور بیزار ہو اس سے جو ہم کام کرتے ہیں، ہم بے تعلق ہیں تمہارے کاموں سے۔"

اس کے بعد پھر روئے خطاب متوجہ ہوتا ہے دوسروں کی طرف:۔

قل یا ایہا الناس قد جاء کم الحق من ربکم فمن اہتدی فانما یہتدی لنفسہ ومن ضل فانما یضل علیہا وما انا علیکم بوکیل۔

یہ بھی تمام عالمِ انسانیت سے خطاب ہے۔

"اے گروہ مردم! خدا کی طرف سے حق تمہارے پاس آیا ہے تو جو شخص صحیح راستہ اختیار کرے گا وہ اپنے خود نجات کا سامان کرے گا اور جو راستہ سے منحرف ہو گا وہ اپنا نقصان کرے گا۔ میں تمہارے افعال کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تمہارے طرزِ عمل کا نگران نہیں ہوں۔"

اس کے بعد مسلمانوں کو تعلیم دی جا رہی ہے:۔

قل للذین لا یؤمنون اعملوا علی مکانتکم انا عاملون وانتظروا انا منتظرون۔

جو ایمان نہیں لاتے تسلیم نہیں کرتے ان سے کہو کہ تم اپنی جگہ پر بطور خود عمل کیے جاؤ۔ ہم بھی کچھ نہ کچھ عمل کرتے ہیں۔ انتظار کرو کہ کس کا عمل نتیجہ میں کامیاب ہوتا ہے۔"

(بالکل مساویانہ گفتگو) جو الفاظ ان کے لیے استعمال کیے گئے وہی اپنے لیے استعمال کیے تاکہ کسی کو ناگوار نہ ہو۔

انما امرت ان اعبد رب ہذہ البلدۃ الذی حرمہا ولہ کل شیئ وامرت ان اکون من المسلمین وان اتلوا القرآن فمن اہتدی فانما یہتدی لنفسہ ومن ضل فقل انما انا من المنذرین

"میں تو اس پر مامور ہوں کہ عبادت کروں اس گھر (خانۂ کعبہ) کے مالک

کی جس نے اس کو محترم قرار دیا ہے۔ اور وہی ہر شئے کا مالک ہے، اور میں مامور ہوا ہوں کہ اسلام اختیار کروں اور قرآن کی تلاوت کروں، تو جو شخص ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنا ہی نفع کرے گا۔ اور جو اس راستے کو چھوڑے گا تو کچھ نہیں، اس سے کہہ دو کہ میرا کام تو فقط ڈرا دینا ہے۔"

قل یا ایہا الکافرون لا اعبد ما تعبدون ولا انتم عابدون ما اعبد ولا انا عابد ما عبدتم ولا انتم عابدون ما اعبد لکم دینکم ولی دین۔

"تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور ہمارے لیے ہمارا دین ہے۔ تم اپنے راستے پر قائم رہو ہم اپنے راستے پر قائم رہیں، اس کا فیصلہ وہاں ہو جائے گا"۔

اس طرح تمام دنیا کو مخاطب کرکے یہ تعلیم دی کہ درحقیقت ایک مسلمان دوسرے شخص کو صرف تبلیغ کرے۔ صرف حق کی آواز پہنچا دیا کرے۔ جو ہر انسان کا فرضِ انسانیت ہے۔ جس طرح ایک کنواں کھدا ہوا ہو، آپ کے ساتھ چراغ ہو۔ آپ بچ کر نکل گئے، دوسرا چراغ لیے بغیر اندھیرے میں جانا چاہتا ہے۔ تو یہاں آپ کی خاموشی جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ بتلا دیجیے کہ راستہ میں کنواں ہے اور حتی الامکان اس کو باور کرانے کی کوشش کیجیے۔ یعنی اگر آپ کے کہنے کو نہیں مانتا، قسم کھانے کی ضرورت ہے، قسم کھا کر بتائیے، جتنا زور دے کر کہنے میں امید ہو کہ مان لے گا، اتنا زور دے کر کہیئے۔ اگر ضرورت ہو تو چراغ ساتھ لے کر چلے جائیے۔

اس نظریہ کے تحت ہی تبلیغ لازم ہے۔ اس لیے کہ یہ تو دنیا کا کنواں ہے جس

میں انسان گرتا ہے لیکن وہاں ہلاکتِ ابدی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس لیے فرض ہے کہ جس بات کو حقیقتاً وہ صحیح سمجھتا ہو اس کو وہ دوسرے تک بھی پہنچائے۔ لیکن بس وہیں تک کہ تبلیغ کے حد میں رہے۔ جہاں تک زور دینا چاہیئے اتنا ہی زور دے۔ جتنا ادلہ اور براہین کے ساتھ آپ اپنے نقطۂ نظر کو واضح کر سکتے ہیں اتنا واضح کیجیے۔ یہ واجب ہے، مگر آپ لڑیئے جھگڑیئے، دنیا میں فتنہ و فساد پیدا کیجیے یہ تعلیم نہیں دی گئی ہے۔

اگر یہ چیزیں پیشِ نظر ہو جائیں تو جھگڑوں کا سدِ باب ہو جائے۔ جھگڑا تو یونہی ہوتا ہے کہ دوسروں کے عمل کا بھی اپنے کو ٹھیکہ دار سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تصادم ہوتا ہے اگر کوئی آپ کے نزدیک برا کام کرتا ہے تو کہہ دیجیے یہ برا کام ہے۔ مگر آپ لڑائی جھگڑے کا کیا حق رکھتے ہیں۔ یہ تصادم اسلامی تعلیم سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ لیکن ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے نام سے جس کسی کے مقابلہ میں ہم کوئی فساد کھڑا کر دیں تو وہ اسلام کی ایک خدمت ہو گی۔ اسلام کا کبھی یہ حکم نہیں ہے۔

قرآن مجید نے ان لوگوں کی جو امن پسند ہوں خواہ وہ غیر مسلمین ہوں تعریف کی ہے۔ ہم تو اتنے تنگ نظر ہو گئے ہیں کہ اگر کسی سے نقطۂ خیال میں فرق ہے تو اس کی اچھائی بھی زبان پر نہ لائیں گے۔ مگر اسلام نے غیر مسلمین کی تعریف کی ہے۔ جو امن پسند ہوں جن کا طرزِ عمل جارحانہ نہ ہو۔ اہلِ کتاب سب ہی تھے، یہودی بھی اور نصاریٰ بھی، لیکن تاریخی حیثیت سے اور حقیقت کے اعتبار سے جس قسم کا طرزِ عمل اسلام کے خلاف یہودیوں نے اختیار کیا نصاریٰ نے نہیں اختیار کیا۔ قریظہ اور نضیر کی لڑائیاں یہودیوں ہی سے تھیں۔ جنگِ خیبر بھی یہودیوں کے مقابلہ میں تھی۔ یہودیوں نے فوج کشی کی، صف آرائی کی، لیکن نصاریٰ وہ تھے جنھوں نے پہلے بہ دلائل و براہین اسلام کا مقابلہ کرنا چاہا۔ محاجہ و استدلال کیا۔ پھر پُرامن مقابلہ یعنی مباہلہ کی صورت

اختیار کی۔ اور جب اس میں ناکامی رونما ہوتے ہوئے دکھلائی دی تو تعصب دامن گیر ضرور ہوا۔ کیونکہ اب اسلام لے آنا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس محبت نے جو اپنے پرانے عقیدہ کے ساتھ تھی ایمان لانے سے باز رکھا۔ مگر جزیہ دے کر مصالحت پر تیار ہوگئے لیکن اتنا امن پسندانہ طرزِ عمل اختیار کیا کہ قرآنِ مجید میں اس بات کی تعریف موجود ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :-

لتجدنّ اشدّ الناس عداوۃ للّذین اٰمنوا الیھود والذین اشرکوا ولتجدنّ اقربھم مودۃ للّذین اٰمنوا الّذین قالوا انا نصاریٰ ذٰلک بان منھم قسّیسین ورھبانا وانھم لا یستکبرون۔

"سخت سے سخت دشمنی تم مسلمانوں کے ساتھ دیکھوگے یہودیوں کی اور ان لوگوں کی جو شرک اختیار کرتے ہیں (یعنی مشرکین قریش) اور دیکھوگے سب سے زیادہ قریب محبت کے اعتبار سے ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان میں پادری لوگ ہیں اور ان میں پہاڑوں پر جاکر تمام دنیا سے بے تعلق ہوجانے والے عابد موجود ہیں اور وہ تکبر سے کام نہیں لیتے۔"

یہ دیکھیئے اسلام کی سچائی اور انصاف پسندی۔ دنیا کہتی ہے اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ یعنی جس نے اسلام کے مقابلہ میں سرتابی کی۔ بس تلوار کھینچ لی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جن لوگوں نے صلح پسندانہ طرزِ عمل اختیار کیا ان کو اسلام الگ رکھتا ہے۔ اور جن لوگوں نے جارحانہ طرزِ عمل اختیار کیا ان کو الگ رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو کیوں نہ اسلام نے نجران میں تلوار کھینچی، کیوں نہ یمن میں عیسائیوں کو برباد کردیا؟ بیشک جن لوگوں نے بزورِ شمشیر مادی طاقتوں سے

چاہا کہ اسلام کو فنا کر دیں، ان کا ردِ عمل اسی طریقہ سے کیا گیا جو ان کے طرزِ عمل کا نتیجہ تھا۔
مگر اسلام نے ان لوگوں کی مدح کی جو غیر مسلمین میں سے امن پسند تھے۔ اور امن کا طریقہ اختیار کرتے تھے۔

یاد رکھیے کہ اگر اسلام کے طرزِ عمل کو ہم اپنا نقطۂ نظر قرار دیں تو ہم خود بھی امن و امان سے رہیں اور دنیا بھی ہمارے ہاتھ سے امن و امان میں رہے۔

مگر ہم نے اس تعلیم کو فراموش کر دیا۔ ہم تو غیر مسلم کے ساتھ کیا اپنوں کے مقابلہ میں بھی رواداری کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم نے یہ بھلا دیا کہ اسلام نے مشرکین قریش کے ساتھ بھی امن پسندی کو نہیں چھوڑا۔ وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله "اگر یہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور خدا پر بھروسا کرو۔"

ہمارے سامنے قرآن مجید میں موجود ہے۔ الصلح خیر صلح بہترین چیز ہے ہمارے سامنے یہ ہے کہ مشرکین قریش کے ساتھ جو برابر اسلام سے لڑتے رہے، قرآن مجید نے یہ تعلیم دی۔ ان قاتلوكم فاقتلوهم۔ اگر یہ تم سے جنگ کریں تو تم بھی جنگ کرو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابتدا ادھر سے قرار پائے گی۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔ وان يقاتلوكم في المسجد الحرام فاقتلوهم۔ اگر یہ تم سے (مسجد حرام میں) جنگ کریں تو تم بھی جنگ کرو۔ حفاظت خود اختیاری کے طور پر جو انسان کا فطری اور لازمی فریضہ ہے۔

مُسلمانوں کے باہمی تعلقات

ہمارے سامنے یہ تعلیمات پیش کیے گئے کہ تم خدا کی رسی کو مضبوط تھامو اور متفرق نہ ہو۔ کہا گیا کہ تم بھائی بھائی ہو۔ آپس میں جھگڑا نہ کرو ۔ آپس میں نہ لڑو۔ اے مسلمانو! نہیں تو یاد رکھو کہ تمہارے قوائے عمل کمزور ہو جائیں گے اور تمہاری ہوا بگڑ جائے گی۔ لاتنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم۔ وہی ہوا جو ہمارے آپس کے افتراق کا نتیجہ تھا، کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی حقانیت کے برکات تھے وہ رخصت ہو گئے۔ لیکن ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ہم بیدار نہیں ہوتے، ہمارے یہاں روز روز نئے نئے فسادات ہوتے ہیں۔ کون زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ جس میں کوئی نہ کوئی فساد نہیں ہوتا۔ جتنا دائرہ محدود ہے اتنا ہی زیادہ جنگ و جدال ہے، ہم تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی نہیں سمجھتے۔ اگر سمجھتے ہوتے تو ویسا ہی برتاؤ بھی اختیار کرتے۔ دشمنی اور عداوت اور چیز ہے اور اختلافِ خیال اور چیز نقطۂ خیال کا افتراق تو انسانی ذہنیت کا خاصہ ہے۔

ہر شخص کو اپنے نقطۂ خیال کا اختیار ہے جس کو وہ صحیح سمجھے اس کو مانے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر کسی سے نقطۂ نظر جدا ہو جائے تو ہم اس کے دشمن بھی ہو جائیں اگر ایسا طرزِ عمل ہو تو نظامِ دنیا میں خلل پڑ جائے۔ ہر جماعت میں اختلاف ہوا کرتے ہیں۔ وہ لوگ کہ جو مستقل فرقوں میں محسوب ہیں ان میں بھی آپس میں ایسے اختلافات ہیں۔ مسائل ہیں کہ وہ سب ایک نقطہ پر جمع نہیں ہوتے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک دوسرے کو تلوار سے فنا کر دے۔ ایک بات ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ آپ کے نزدیک غلط ہے اس کی وجہ سے فتنہ و فساد کیوں قائم ہو۔ ہم اپنے خلاف بات

سننے پر تیار کیوں نہ ہوں؟ ہم اتنے تنگ نظر کیوں نہ ہوں کہ بس اسی کو سن سکیں۔ کہ جو بات ہمارے خلاف نہ ہو لیکن کتنے ہی ملائم الفاظ میں کیوں نہ ہو اسے ہم سننے پر ہی تیار نہیں جو ہمارے نقطۂ نظر سے ذرا مخالف ہو۔

یہ آخر ہم اپنے گوشِ اعتبار پر پردے کیوں ڈال لیں۔ ہم اپنی چشمِ حقیقت بیں کو حجاب میں کیوں چھپائیں۔ درحقیقت خدا نے آنکھیں دی ہیں دیکھنے کے لیئے اور کان دیے ہیں سننے کے لیے۔ اگر کان دیے ہیں سننے کے لیے تو ان سے ہم کو اپنے خلاف باتیں بھی سننا چاہئیں تاکہ ہماری قوتِ تمیز بھی کام کر سکے۔ تمیز تو جداگانہ چیزوں میں ہی ہوا کرتی ہے اگر جداگانہ چیزیں سامنے نہ ہوں تو قوتِ تمیز بیکار ہو گی۔ اس لیے ہم میں اتنی وسعتِ نظر پیدا ہونا چاہیئے کہ کشادہ دلی سے اپنے خلاف باتیں بھی سن سکیں جس طرح اپنی بات سن سکتے ہیں اسی طرح اپنے غیر کی بات بھی سن سکیں۔ اس کے بعد یہ اختیار ہے ہم کو کہ ہم مانیں یا نہ مانیں، سنکر ہاتھ پاؤں میں زنجیریں تو پڑ نہیں جایا کرتیں۔ اگر صحیح معلوم ہو تسلیم کر لیں غلط معلوم ہو چھوڑ دیں۔ یہ ہی تعلیم ہے جو اسلام نے دی۔ اس نے مشرکین کی بھی آوازوں کو سنا، نصاریٰ کی بھی آوازوں کو سنا، یہودیوں کی بھی آوازوں کو سنا، جواب کا موقع ہوا۔ جواب دیا۔

لیکن یہ کہ سننے ہی کو تیار نہ ہوں یہ اسلام نے مسلمانوں کو تعلیم نہیں دی۔ اس نے تو مذمت ان لوگوں کی کی ہے۔ "یہ لوگ تو جب تم بات کہنا چاہتے ہو تو کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں تاکہ کچھ نہ سنیں"۔ یہ تو کافروں کا طرزِ عمل تھا ہم کو تو سننا چاہیئے۔ اس کے بعد ہمیں یہ حق ہے کہ کہیں غلط ہے۔ صحیح نہیں ہے۔ اس کے غلط کہنے پر کہنے والے کو بھی بُرا نہ ماننا چاہیئے اگر یہ بات پیدا ہو جائے تو پھر فتنہ وفساد نہ ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں مختلف نظریوں کا وجود ہی نہ ہو۔

بے شک اگر خدا انھیں اپنی جبری طاقت سے چاہے تو سب کو ایک کر دے گا لیکن

خدا اپنی جبری طاقت کو تو صرف ہی کرنا نہیں چاہتا۔ اس نے تو اختیار دے دیا جس کا جی چاہے ایمان لائے جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بدلا کاہے کا ہوتا۔ اسی معصیت کے اختیار پہ تو بدلے کی بنیاد قائم ہے۔ جزا اور سزا کی بنیاد قائم ہے اب اگر نظامِ عالم درست ہو سکتا ہے تو اسی طرح درست ہو سکتا ہے کہ اختلافِ نظر کے ساتھ ساتھ ہر ایک دوسرے کے اختلافِ خیال کو برداشت کر سکے۔ تب ہی نظامِ دنیا درست ہو سکتا ہے۔

جسمِ انسانی عناصر سے مرکب ہے اور یہ عناصر سب آپس میں اضداد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خاصیتیں سب کی الگ الگ ہیں مگر خالق نے ان سب کو ایک جسم میں جگہ دی ہے اس طرح کہ کوئی دوسرے کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

اس نظام کو خالق نے اپنے ہاتھ سے مرتب کر کے ہم کو یہ سبق دیا کہ اگر کسی ملک میں مختلف اقوام و مذاہب ہوں تو انھیں اس طرح مل کر رہنا چاہیے۔ ہر ایک کو اپنا کام کرنا چاہیئے اس طرح کہ مفادِ اجتماعی کو نقصان نہ پہنچے۔ اور کسی کو اپنی حد سے قدم آگے نہیں بڑھانا چاہیئے۔ ورنہ تصادم ہوگا۔ اور تصادم کا آخری نتیجہ فنا ہے۔

کمزور اور طاقتور کا مقابلہ اگر ہو تو طاقتور ممکن ہے اپنی طاقت سے کمزور کو فنا کے گھاٹ اتار دے مگر اس کے نتائجِ بد سے وہ طاقتور بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

بلاشبہ اسلام کے تعلیمات وہ ہیں جو افراد و اقوام میں نظم و ضبط اور امن و سلامتی پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اگر دنیا ان تعلیمات پر عمل کرے تو وہ امن و سکون کی اس جنت میں پہنچ جائے گی جہاں راحت و آرام کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔